تفہیم القرآن

اَلُاَنفال

(۸)

الانفال

زمانۂ نزول یہ سورہ ۲ ہجری میں جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس میں اسلام و کفر کی اِس پہلی جنگ پر مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک سورہ کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے، غالباً یہ ایک ہی تقریر ہے جو بیک وقت نازل فرمائی گئی ہوگی، مگر ممکن ہے کہ اس کی بعض آیات جنگِ بدر ہی سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق بعد میں اُتری ہوں اور پھر ان کو سلسلۂ تقریر میں مناسب جگہوں پر درج کر کے ایک مسلسل تقریر بنا دیا گیا ہو۔ بہر حال کلام میں کہیں کوئی ایسا جوڑ نظر نہیں آتا جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ یہ الگ الگ دو تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

تاریخی پس منظر قبل اس کے کہ اس سورہ پر تبصرہ کیا جائے، جنگِ بدر اور اس سے تعلق رکھنے والے حالات پر ایک تاریخی نگاہ ڈال لینی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ابتدائی دس بارہ سال میں، جب کہ آپؐ مکہ معظّمہ میں مقیم تھے، اِس حیثیت سے اپنی پختگی و استواری ثابت کر چکی تھی کہ ایک طرف اس کی پشت پر ایک بلند سیرت، عالی ظرف اور دانش مندانہ عَلَم بردار موجود تھا جو اپنی شخصیت کا پورا سرمایہ اس کام میں لگا چکا تھا اور اس کے طرزِ عمل سے یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ وہ اس دعوت کو انتہائی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے اٹل ارادہ رکھتا ہے اور اس مقصد کی راہ میں ہر خطرے کو انگیز کرنے اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف اس دعوت میں خود ایسی کشش تھی کہ وہ دلوں اور دماغوں میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی اور جہالت و جاہلیّت اور تعصُّبات کے حصار اس کی راہ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اسی وجہ سے عرب کے پرانے نظامِ جاہلی کی حمایت کرنے والے عناصر، جو ابتداءً اس کو اِستخفاف کی نظر سے دیکھتے تھے، مکّی دَور کے آخری زمانے میں اسے ایک سنجیدہ خطرہ سمجھنے لگے تھے اور اپنا پورا زور اسے کچل دینے میں صَرف کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن اُس وقت تک چند حیثیات سے اس دعوت میں بہت کچھ کسر باقی تھی:

اوّلاً، یہ بات ابھی پوری طرح ثابت نہیں ہوئی تھی کہ اس کو ایسے پیرووٴں کی ایک کافی تعداد بہم پہنچ گئی ہے جو صرف اس کے ماننے والے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے اُصولوں کا سچا عشق بھی رکھتے ہیں، اس کو غالب و نافذ کرنے کی سعی میں اپنی ساری قوتیں اور اپنا تمام سرمایۂ زندگی کھپا دینے کے لیے تیار ہیں، اور اس کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے لیے، دنیا بھر سے لڑ جانے کے لیے، حتّٰی کہ اپنے عزیز ترین رشتوں کو بھی کاٹ پھینکنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگرچہ مکہ میں پیروانِ اسلام نے قریش کے ظلم و ستم برداشت کر کے

اپنی صداقتِ ایمانی اور اسلام کے ساتھ اپنے تعلق کی مضبوطی کا اچھا خاصا ثبوت دے دیا تھا، مگر ابھی یہ ثابت ہونے کے لیے بہت سی آزمایشیں باقی تھیں کہ دعوتِ اسلامی کو جاں فروش پیروؤں کا وہ گروہ ہے جو اپنے نصب العین کے مقابلے میں کسی چیز کو بھی عزیز تر نہیں رکھتا۔

ثانیاً، اس دعوت کی آواز اگرچہ سارے ملک میں پھیل گئی تھی، لیکن اس کے اثرات منتشر تھے، اس کی فراہم کردہ قوت سارے ملک میں پراگندہ تھی، اس کو وہ اجتماعی طاقت بہم نہ پہنچی تھی جو پُرانے جمے ہوئے نظامِ جاہلیّت سے فیصلہ کُن مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھی۔

ثالثاً، اس دعوت نے زمین میں کسی جگہ بھی جڑ نہیں پکڑی تھی بلکہ ابھی تک وہ صرف ہوا میں سرایت کر رہی تھی۔ ملک کا کوئی خطّہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ قدم جما کر اپنے مَوقِف کو مضبوط کرتی اور پھر آگے بڑھنے کی سعی کرتی۔ اُس وقت تک مسلمان جہاں بھی تھا، اس کی حیثیت نظامِ کفروشرک میں بالکل ایسی تھی جیسے خالی معدے میں کونین، کہ معدہ ہر وقت اسے اُگل دینے کے لیے زور لگا رہا ہو اور قرار پکڑنے کے لیے اس کو جگہ ہی نہ ملتی ہو۔

رابعاً، اس وقت تک اِس دعوت کو عملی زندگی کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ نہ یہ اپنا تمدّن قائم کرسکی تھی، نہ اس نے اپنا نظامِ معیشت و معاشرت اور نظامِ سیاست مرتّب کیا تھا، اور نہ دوسری طاقتوں سے اس کے معاملاتِ صلح و جنگ پیش آئے تھے۔ اس لیے نہ تو اُن اخلاقی اُصولوں کا مظاہرہ ہوسکا تھا جن پر یہ دعوت زندگی کے پورے نظام کو قائم کرنا اور چلانا چاہتی تھی، اور نہ یہی بات آزمایش کی کسَوٹی پر اچھی طرح نمایاں ہوئی تھی کہ اس دعوت کا پیغمبرؐ اور اس کے پیروؤں کا گروہ جس چیز کی طرف دنیا کو دعوت دے رہا ہے، اس پر عمل کرنے میں وہ خود کس حد تک راست باز ہے۔

بعد کے واقعات نے وہ مواقع پیدا کر دیے جن سے یہ چاروں کمیاں پوری ہوگئیں۔

مکّی دَور کے آخری تین چار سالوں سے یثرب میں آفتابِ اسلام کی شعاعیں مسلسل پہنچ رہی تھیں اور وہاں کے لوگ متعدّد وُجوہ سے عرب کے دوسرے قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ اس روشنی کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ آخرِکار نبوت کے بارھویں سال حج کے موقع پر ۷۵ نُفوس کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپؐ کو اور آپؐ کے پیروؤں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔ اہلِ یثرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب اور اپنے امام وفرماں روا کی حیثیت سے بلا رہے تھے۔ اور اسلام کے پیروؤں کو ان کا بُلاوا اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خِطّوں میں جو

مسلمان منتشر ہیں، وہ یثرب میں جمع ہو کر اور یثربی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظّم معاشرہ بنالیں۔ اس طرح یثرب نے دراصل اپنے آپ کو "مدینۃ الاسلام" کی حیثیت سے پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کر کے عرب میں پہلا دارالاسلام بنالیا۔

اس پیش کش کے معنیٰ جو کچھ تھے اس سے اہلِ مدینہ ناواقف نہ تھے۔ اس کے صاف معنیٰ یہ تھے کہ ایک چھوٹا سا قصبہ اپنے آپ کو پورے ملک کی تلواروں اور مَعاشی وتمدُّنی بائیکاٹ کے مقابلے میں پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ بیعتِ عَقَبَہ کے موقع پر رات کی اُس مجلس میں اسلام کے ان اوّلین مددگاروں (انصار) نے اس نتیجے کو خوب اچھی طرح جان بُوجھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ عین اُس وقت جب کہ بیعت ہو رہی تھی، یثربی وفد کے ایک نوجوان رکن اَسعدؓ بن زُرارَہ نے، جو پورے وفد میں سب سے کم سِن شخص تھے، اُٹھ کر کہا:

رویدًا یا اھل یثرب! انا لم نضرب الیہ اکباد الابل الا ونحن نعلم انہ رسول اللّٰہ، وان اخراجہ الیوم مناوأۃ للعرب کافۃ، وقتل خیارکم، وتعضکم السیوف ۔ فاما انتم قوم تصبرون علٰی ذٰلک فخذوہ واجرہ علی اللّٰہ ، واما انتم قوم تخافون من انفسکم خیفۃ فذروہ فبینوا ذٰلک فھو اعذر لکم عند اللّٰہ ۔

"ٹھیرو اے اہلِ یثرب! ہم لوگ جو اِن کے پاس آئے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج اِنھیں یہاں سے نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمھارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی۔ لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ اور اگر تمھیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو، کیونکہ اس وقت عُذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔"

اسی بات کو وفد کے ایک دوسرے شخص عباسؓ بن عُبادہ بن نَضْلَہؓ نے دُہرایا:

اتعلمون علام تبایعون ھٰذا الرجل؟ (قالوا نعم، قال) انکم تبایعونہ علٰی حرب الاحمر والاسود من الناس ۔ فان کنتم ترون انکم اذا نھکت اموالکم مصیبۃ واشرافکم قتلا اسلمتموہ فمن الاٰن فدعوہ ، فھو واللّٰہ ان فعلتم خزی الدنیا والاٰخرۃ وان کنتم ترون انکم وافون لہ بما دعوتموہ الیہ علی نھکۃ الاموال وقتل الاشراف فخذوہ، فھو واللّٰہ خیرالدنیا والاٰخرۃ۔

"جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ (آوازیں، ہاں جانتے ہیں) تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ پس اگر تمھارا خیال یہ ہو کہ جب تمھارے مال تباہی کے اور تمھارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ

آج ہی اسے چھوڑ دو، کیونکہ خدا کی قسم! یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے۔ اور اگر تمھارا ارادہ یہ ہے کہ جو بُلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے باوجود نِبا ہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم! یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔‘‘

اس پر تمام وفد نے بالاتفاق کہا: فانا ناخذہ علی مصیبۃ الاموال وقتل الاشراف ’’ہم اسے لے کر اپنے اموال کو تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔‘‘ تب وہ مشہور بیعت واقع ہوئی جسے تاریخ میں بیعتِ عَقَبۂ ثانیہ کہتے ہیں۔

دوسری طرف اہلِ مکہ کے لیے یہ معاملہ جو معنٰی رکھتا تھا، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ دراصل اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، جن کی زبردست شخصیّت اور غیر معمولی قابلیتوں سے قریش کے لوگ واقف ہو چکے تھے، ایک ٹھکانا میسر آرہا تھا، اور ان کی قیادت و رہنمائی میں پیروانِ اسلام، جن کی عزیمت و استقامت اور فدائیت کو بھی قریش ایک حد تک آزما چکے تھے، ایک منظّم جتھے کی صورت میں مجتمع ہوئے جاتے تھے۔ یہ پرانے نظام کے لیے موت کا پیغام تھا۔ نیز مدینہ جیسے مَقام پر مسلمانوں کی اس طاقت کے مجتمع ہونے سے قریش کو مزید خطرہ یہ تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو تجارتی شاہراہ ساحلِ بحرِ احمر کے کنارے کنارے جاتی تھی، جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے مشرک قبائل کی مَعاشی زندگی کا انحصار تھا، وہ مسلمانوں کی زد میں آجاتی تھی اور اس شہ رگ پر ہاتھ ڈال کر مسلمان نظامِ جاہلی کی زندگی دشوار کر سکتے تھے۔ صرف اہلِ مکہ کی وہ تجارت جو اس شاہراہ کے بل پر چل رہی تھی، ڈھائی لاکھ اشرفی سالانہ تک پہنچتی تھی۔ طائف اور دوسرے مَقامات کی تجارت اس کے ماسوا تھی۔

قریش اِن نتائج کو خوب سمجھتے تھے۔ جس رات بیعتِ عَقَبہ واقع ہوئی، اسی رات اس معاملے کی بھنک اہلِ مکہ کے کانوں میں پڑی اور پڑتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ پہلے تو انھوں نے اہلِ مدینہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑنے کی کوشش کی۔ پھر جب مسلمان ایک ایک دو دو کر کے مدینے کی طرف ہجرت کرنے لگے اور قریش کو یقین ہو گیا کہ اب محمدؐ بھی وہاں منتقل ہو جائیں گے تو وہ اس خطرے کو روکنے کے لیے آخری چارۂ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہجرتِ نبوی سے چند ہی روز پہلے قریش کی مجلسِ شُوریٰ منعقد ہوئی جس میں بڑی رَدّ وکَد کے بعد آخرِ کار یہ طے پا گیا کہ بنی ہاشم کے سوا تمام خانوادہ ہائے قریش کا ایک ایک آدمی چھانٹا جائے اور یہ سب لوگ مل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کریں، تاکہ بنی ہاشم کے لیے تمام خاندانوں سے تنہا لڑنا مشکل ہو جائے اور وہ انتقام کے بجائے خوں بہا قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن خدا کے فضل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد علی اللہ اور حسنِ تدبیر سے اُن کی یہ چال ناکام ہو گئی اور حضورؐ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ اس طرح جب قریش کو ہجرت کے روکنے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مدینے کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ کو (جسے ہجرت سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے اور جس کی تمناؤں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ

پہنچ جانے اور اَوس وخَزرَج کی اکثریت کے مسلمان ہوجانے سے پانی پھر چکا تھا) خط لکھا کہ ''تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اس سے لڑو یا اسے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمھارے مَردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔'' عبداللہ بن اُبَیّ اس پر کچھ آمادۂ شر ہوا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بروقت اس کے شر کی روک تھام کر دی۔ پھر سعدؓ بن مُعاذ رئیسِ مدینہ عُمرے کے لیے مکّہ گئے۔ وہاں عین حرم کے دروازے پر ابوجہل نے ان کو ٹوک کر کہا: الا اُراك تطوف بمکۃ اٰمنًا وقد اویتم الصُباۃ وزعمتم انکم تنصرونھم وتعینونھم؟ لولا انك مع ابی صفوان ما رجعت الٰی اھلك سالمًا (تم تو ہمارے دین کے مرتدوں کو پناہ دو اور ان کی امداد واعانت کا دم بھرو اور ہم تمھیں اطمینان سے مکّے میں طواف کرنے دیں؟ اگر تم اُمَیَّہ بن خَلَف کے مہمان نہ ہوتے تو زندہ یہاں سے نہیں جاسکتے تھے)۔ سعدؓ نے جواب میں کہا: واللّٰہ لئن منعتنی ھٰذا لامنعنك ما ھو اشد علیك منہ، طریقك علی المدینۃ (بخدا اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمھیں اُس چیز سے روک دوں گا جو تمھارے لیے اس سے شدید تر ہے، یعنی مدینے پر سے تمھاری رہ گزر)۔ یہ گویا اہلِ مکہ کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ زیارتِ بیت اللہ کی راہ مسلمانوں پر بند ہے، اور اس کا جواب اہلِ مدینہ کی طرف سے یہ تھا کہ شامی تجارت کا راستہ مخالفینِ اسلام کے لیے پُرخطر ہے۔

اور فی الواقع اُس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر بھی نہ تھی کہ اس تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کریں، تاکہ قریش اور وہ دوسرے قبائل جن کا مفاد اس راستے سے وابستہ تھا، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی مُعاندانہ ومزاحمانہ پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے مجبور ہوجائیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نوخیز اسلامی سوسائٹی کے ابتدائی نظم ونسق اور اطرافِ مدینہ کی یہودی آبادیوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر توجہ منعطف فرمائی، وہ اسی شاہراہ کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے میں حضورؐ نے دو اہم تدبیریں اختیار کیں:

ایک یہ کہ مدینہ اور ساحلِ بحرِ احمر کے درمیان اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے، ان کے ساتھ گفت وشنید شروع کی، تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم ازکم ناطرف داری کے معاہدے کرلیں۔ چنانچہ اس میں آپؐ کو پوری کامیابی ہوئی۔ سب سے پہلے جُہَینَہ سے، جو ساحل کے قریب پہاڑی علاقے میں ایک اہم قبیلہ تھا، معاہدۂ ناطرف داری طے ہوا۔ پھر ۱ ہجری کے آخر میں بنی ضَمرَہ سے جن کا علاقہ یَنبُوع اور ذوالعُشیرہ سے متصل تھا، دفاعی معاونت (defensive alliance) کی قرار داد ہوئی۔ پھر ۲ ہجری کے وسط میں بنی مُدلِج بھی اس قرار داد میں شریک ہوگئے کیونکہ وہ بنی ضَمرَہ کے ہمسایے اور حلیف تھے۔ مزید برآں تبلیغِ اسلام نے ان قبائل میں اسلام کے حامیوں اور پیروؤں کا بھی ایک اچھا خاصا عُنصر پیدا کر دیا۔

دوسری تدبیر آپؐ نے یہ اختیار کی کہ قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لیے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے

چھوٹے دستے بھیجنے شروع کیے، اور بعض دستوں کے ساتھ آپؐ خود بھی تشریف لے گئے۔ پہلے سال اس طرح کے چار دستے گئے جو مغازی کی کتابوں میں سَرِیّۂ حمزہ، سَرِیّۂ عُبَیدہ بن حارِث، سَرِیّۂ سعد بن ابی وَقّاص اور غزوۃ الاَبْواء کے نام سے موسوم ہیں[1]۔ اور دوسرے سال کے ابتدائی مہینوں میں دو مزید تاختیں اسی جانب کی گئیں جن کو اہلِ مغازی غزوۂ بُواط اور غزوۂ ذوالعُشَیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان تمام مہموں کی دو خصوصیتیں قابلِ لحاظ ہیں: ایک یہ کہ ان میں سے کسی میں نہ تو کُشت و خون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لُوٹا گیا، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان تاختوں کا اصل مقصود قریش کو ہوا کا رُخ بتانا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی تاخت میں بھی حضورؐ نے اہلِ مدینہ کا کوئی آدمی نہیں لیا بلکہ تمام دستے خالص مکّی مہاجرین سے ہی مرتب فرماتے رہے، تاکہ حتی الامکان یہ کشمکش قریش کے اپنے ہی گھر والوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں اُلجھنے سے آگ پھیل نہ جائے۔ اُدھر سے اہلِ مکہ بھی مدینے کی طرف غارت گر دستے بھیجتے رہے، چنانچہ انھی میں سے ایک دستے نے کُرز بن جابر الفِہری کی قیادت میں عین مدینہ کے قریب ڈاکا مارا اور اہلِ مدینہ کے مویشی لُوٹ لیے۔ قریش کی کوشش اس سلسلے میں یہ رہی کہ دوسرے قبیلوں کو بھی اس کشمکش میں اُلجھا دیں، نیز یہ کہ انھوں نے بات کو محض دھمکی تک محدود نہ رکھا بلکہ لُوٹ مار تک نوبت پہنچا دی۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ شعبان ۲ ہجری (فروری یا مارچ ۶۲۳ء) میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ، جس کے ساتھ تقریباً ۵۰ ہزار اشرفی کا مال تھا اور تیس چالیس سے زیادہ محافظ نہ تھے، شام سے مکہ کی طرف پلٹتے ہوئے اُس علاقے میں پہنچا جو مدینہ کی زد میں تھا۔ چونکہ مال زیادہ تھا، محافظ کم تھے، اور سابق حالات کی بنا پر خطرہ قوی تھا کہ کہیں مسلمانوں کا کوئی طاقتور دستہ اس پر چھاپا نہ مار دے، اس لیے سردارِ قافلہ ابوسفیان نے اس پُرخطر علاقے میں پہنچتے ہی ایک آدمی کو مکے کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہاں سے مدد لے آئے۔ اس شخص نے مکّہ پہنچتے ہی عرب کے قدیم قاعدے کے مطابق اپنے اُونٹ کے کان کاٹے، اس کی ناک چیر دی، کجاوے کو اُلٹ کر رکھ دیا اور اپنا قمیص آگے پیچھے سے پھاڑ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ: **یا معشر قریش! اللطیمہ اللطیمہ، اموالکم مع ابی سفیان قد عرض لہا محمد فی اصحابہ، لا أُریٰ ان تُدرکوھا ، الغوث ، الغوث** (قریش والو! اپنے قافلۂ تجارت کی خبر لو، تمھارے مال جو ابوسفیان کے ساتھ ہیں، محمدؐ اپنے آدمی لے کر ان کے درپے ہوگیا ہے، مجھے اُمید نہیں کہ تم انھیں پا سکو گے، دوڑو دوڑو مدد کے لیے)۔ اس پر سارے مکہ میں ہیجان برپا ہوگیا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لیے تیار ہوگئے۔ تقریباً ایک ہزار مردانِ جنگی، جن میں سے ۶۰۰ زِرہ پوش تھے اور جن میں سو سواروں کا رسالہ بھی شامل تھا، پوری شان و شوکت کے ساتھ لڑنے کے لیے چلے۔

---

[1] اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں سَرِیّہ اُس مہم کو کہتے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کی قیادت میں بھیجا کرتے تھے اور غَزوہ اُس مہم کو کہتے تھے جس کی قیادت حضورؐ خود فرماتے تھے۔

اُن کے پیشِ نظر صرف یہی کام نہ تھا کہ اپنے قافلے کو بچالائیں، بلکہ وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اس آئے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں، اور مدینہ میں یہ مخالف طاقت جو ابھی نئی نئی مجتمع ہونی شروع ہوئی ہے اسے کچل ڈالیں، اور اس نواح کے قبائل کو اس حد تک مرعوب کر دیں کہ آیندہ کے لیے یہ تجارتی راستہ بالکل محفوظ ہو جائے۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے، محسوس فرمایا کہ فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے اور یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب کہ ایک جَسُورانہ اِقدام اگر نہ کر ڈالا گیا تو تحریکِ اسلامی ہمیشہ کے لیے بے جان ہو جائے گی، بلکہ بعید نہیں کہ اس تحریک کے لیے سر اُٹھانے کا پھر کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ نئے دار الہجرت میں آئے ابھی پورے دو سال بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہاجرین بے سروسامان، انصار ابھی ناآزمودہ، یہودی قبائل برسرِ مخالفت، خود مدینے میں منافقین و مشرکین کا ایک اچھا خاصا طاقتور عُنصر موجود، اور گردوپیش کے تمام قبائل قریش سے مرعوب بھی اور مذہباً ان کے ہمدرد بھی۔ ایسے حالات میں اگر قریش مدینے پر حملہ آور ہو جائیں تو ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن اگر وہ حملہ نہ کریں اور صرف اپنے زور سے قافلے کو بچا کر ہی نکال لے جائیں اور مسلمان دبکے بیٹھے رہیں، تب بھی یک لخت مسلمانوں کی ایسی ہوا اُکھڑے گی کہ عرب کا بچہ بچہ ان پر دلیر ہو جائے گا اور ان کے لیے ملک بھر میں پھر کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی۔ آس پاس کے سارے قبائل قریش کے اشاروں پر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مدینے کے یہودی اور منافقین و مشرکین علی الاعلان سر اُٹھائیں گے اور دار الہجرت میں جینا مشکل کر دیں گے۔ مسلمانوں کا کوئی رعب و اثر نہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے کسی کو ان کی جان، مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالنے میں تأمُّل ہو۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عزم فرما لیا کہ جو طاقت بھی اس وقت میسر ہے، اسے لے کر نکلیں اور میدان میں فیصلہ کریں کہ جینے کا بل بوتا کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔

اس فیصلہ کُن اقدام کا ارادہ کر کے آپؐ نے انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے ساری پوزیشن صاف صاف رکھ دی کہ ایک طرف شمال میں تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف جنوب سے قریش کا لشکر چلا آ رہا ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تمھیں مل جائے گا، بتاؤ تم کس کے مقابلے پر چلنا چاہتے ہو؟ جواب میں ایک بڑے گروہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہُوا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر کچھ اور تھا، اس لیے آپؐ نے اپنا سوال دُہرایا۔ اس پر مہاجرین میں سے مِقدادؓ بن عَمرو نے اُٹھ کر کہا: یا رسول اللّٰہ، امض لما امرك اللّٰہ، فانا معك حیثما احببت، لا نقول لك کما قال بنو اسرائیل لموسٰی اذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ، ولٰکن اذھب انت و ربك فقاتلا انا معکما مقاتلون ما دامت عین منا تطرف۔ ”یا رسولؐ اللہ! جدھر آپؐ کا رب آپؐ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلیے، ہم آپؐ کے

ساتھ ہیں جس طرف بھی آپ جائیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمھارا خدا دونوں لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں، ہم کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا، دونوں لڑیں، اور ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے، جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔" مگر لڑائی کا فیصلہ انصار کی رائے معلوم کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ابھی تک فوجی اقدامات میں ان سے کوئی مدد نہیں لی گئی تھی اور ان کے لیے یہ آزمایش کا پہلا موقع تھا کہ اسلام کی حمایت کا جو عہد انھوں نے اوّل روز کیا تھا اسے وہ کہاں تک نباہنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے حضورؐ نے براہِ راست ان کو مخاطب کیے بغیر پھر اپنا سوال دُہرایا۔ اس پر سعدؓ بن مُعاذ اُٹھے اور انھوں نے عرض کیا: شاید حضورؐ کا رُوئے سُخن ہماری طرف ہے؟ فرمایا: ہاں۔ انھوں نے کہا: لقد اٰمنا بك وصدقناك وشهدنا ان ما جئت به هو الحق واعطيناك عهودنا ومواثيقنا على السّمع والطاعة۔ فامض يا رسول اللّٰه لما اردت۔ فوالذی بعثك بالحق لو استعرضت بنا هٰذا البحر فخضتهٗ لخضناه معك وما تخلف منا رجل واحد۔ وما نكره ان تلقى بنا عدونا غدًا انا لنصبر عند الحرب صُدُقٌ عند اللقآء ولعل اللّٰه يريك منا ما تقر به عينك فسربنا علٰى بركة اللّٰه۔ "ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسولؐ! جو کچھ آپ نے ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اُتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ کُودیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بِھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے، مقابلے میں سچّی جاں نثاری دکھائیں گے، اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دِکھوا دے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں۔"

ان تقریروں کے بعد فیصلہ ہو گیا کہ قافلے کے بجائے لشکرِ قریش ہی کے مقابلے پر چلنا چاہیے۔ لیکن یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جو لوگ اس تنگ وقت میں لڑائی کے لیے اُٹھے تھے، اُن کی تعداد تین سو سے کچھ زائد تھی (۸۶ مہاجر، ۶۱ قبیلۂ اَوس کے اور ۱۷۰ قبیلۂ خَزرَج کے) جن میں صرف دو تین کے پاس گھوڑے تھے اور باقی آدمیوں کے لیے ۷۰ اُونٹوں سے زیادہ نہ تھے، جن پر تین تین چار چار اشخاص باری باری سے سوار ہوتے تھے۔ سامانِ جنگ بھی بالکل ناکافی تھا۔ صرف ۶۰ آدمیوں کے پاس زرہیں تھیں۔ اسی لیے چند سرفروش فدائیوں کے سوا اکثر آدمی جو اس خطرناک مہم میں شریک تھے، دلوں میں سہم رہے تھے اور انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جانتے بُوجھتے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ مَصلَحت پرست لوگ، جو اگرچہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر ایسے ایمان کے قائل نہ تھے جس میں جان و مال کا زیاں ہو، اس مہم کو دیوانگی

سے تعبیر کر رہے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ دینی جذبے نے ان لوگوں کو پاگل بنا دیا ہے۔ مگر نبیؐ اور مومنین صادقین یہ سمجھ چکے تھے کہ یہ وقت جان کی بازی لگانے ہی کا ہے، اس لیے اللہ کے بھروسے پر وہ نکل کھڑے ہوئے اور انھوں نے سیدھی جنوب مغرب کی راہ لی جدھر سے قریش کا لشکر آ رہا تھا۔ حالانکہ اگر ابتدا میں قافلے کو لُوٹنا مقصود ہوتا تو شمال مغرب کی راہ لی جاتی۔[1]

۱۷ رمضان کو بدر کے مقام پر فریقین کا مقابلہ ہوا۔ جس وقت دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ تین کافروں کے مقابلے میں ایک مسلمان ہے اور وہ بھی پوری طرح مسلّح نہیں ہے، تو خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے اور انتہائی خُضوع وتضرُّع کے ساتھ عرض کرنا شروع کیا: اللھم ھٰذہٖ قریش قد اتت بخیلائھا تحاول ان تکذب رسولك، اللھم فنصرك الذی وعدتنی، اللّٰھم ان تھلك ھٰذہ العصابۃ الیوم لا تعبد۔ ”خدایا! یہ ہیں قریش، اپنے سامانِ غرور کے ساتھ آئے ہیں تاکہ تیرے رسولؐ کو جھوٹا ثابت کریں، خداوندا! بس اب آ جائے تیری وہ مدد جس کا تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، اے خدا! اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو رُوئے زمین پر پھر تیری عبادت نہ ہوگی۔“

اس معرکۂ کارزار میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرینِ مکہ کا تھا جن کے اپنے بھائی بند سامنے صف آرا تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی اس کی اپنی تلوار کی زد میں آ رہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمایش سے صرف وہی لوگ گزر سکتے تھے جنھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہو اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے قطع کر ڈالنے پر تُل گئے ہوں۔ اور انصار کا امتحان بھی کچھ کم سخت نہ تھا۔ اب تک تو انھوں نے عرب کے طاقتور ترین قبیلے، قریش اور اس کے حلیف قبائل کی دشمنی صرف اسی حد تک مول لی تھی کہ ان کے عَلَی الرَّغم مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دے دی تھی۔ لیکن اب تو وہ اسلام کی حمایت میں ان کے خلاف لڑنے بھی جا رہے تھے، جس کے معنیٰ یہ تھے کہ ایک چھوٹی سی بستی جس کی آبادی چند ہزار نُفوس سے زیادہ نہیں ہے، سارے ملکِ عرب سے لڑائی مول لے رہی ہے۔ یہ جسارت صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو کسی صداقت پر ایسا ایمان لے آئے ہوں کہ اس کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کی انھیں ذرّہ برابر پروانہ رہی ہو۔ آخرِ کار ان لوگوں کی صداقتِ ایمانی

---

1 یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنگِ بدر کے بیان میں تاریخ وسیرت کے مصنّفین نے اُن رِوایات پر اعتماد کر لیا ہے جو حدیث اور مَغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، لیکن ان رِوایات کا بڑا حصّہ قرآن کے خلاف ہے اور قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ محض ایمان ہی کی بنا پر ہم جنگِ بدر کے متعلق قرآن کے بیان کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے پر مجبُور نہیں ہیں، بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی آج اس جنگ کے متعلق اگر کوئی معتبر ترین بیان موجود ہے تو وہ یہی سورۂ انفال ہے، کیونکہ یہ لڑائی کے بعد ہی مُتّصلاً نازل ہوئی تھی اور خود شرکائے جنگ اور مخالف وموافق سب نے اس کو سنا اور پڑھا تھا۔ معاذ اللہ! اس میں کوئی ایک بات بھی خلافِ واقعہ ہوتی تو ہزاروں زبانیں اس کی تردید کر ڈالتیں۔

خدا کی طرف سے نصرت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور قریش اپنے سارے غرورِ طاقت کے باوجود ان بے سروسامان فدائیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ان کے ۷۰ آدمی مارے گئے، ۷۰ قید ہوئے، اور ان کا سروسامان غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قریش کے بڑے بڑے سردار جو ان کے گلہائے سَرسَبَد اور اسلام کی مخالف تحریک کے رُوحِ رواں تھے، اس معرکے میں ختم ہو گئے اور اس فیصلہ کُن فتح نے عرب میں اسلام کو ایک قابلِ لحاظ طاقت بنا دیا۔ جیسا کہ ایک مغربی محقق نے لکھا ہے: ''بدر سے پہلے اسلام محض ایک مذہب اور ریاست تھا، مگر بدر کے بعد وہ مذہبِ ریاست بلکہ خود ریاست بن گیا۔''

مباحث یہ ہے وہ عظیم الشان معرکہ جس پر قرآن کی اس سورہ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ مگر اس تبصرے کا انداز تمام اُن تبصروں سے مختلف ہے جو دنیوی بادشاہ اپنی فوج کی فتح یابی کے بعد کیا کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اُن خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو اَخلاقی حیثیت سے ابھی مسلمانوں میں باقی تھیں، تاکہ آیندہ اپنی مزید تکمیل کے لیے سعی کریں۔

پھر اُن کو بتایا گیا ہے کہ اس فتح میں تائیدِ الٰہی کا کتنا بڑا حصہ تھا، تاکہ وہ اپنی جرأت وشہامت پر نہ پھولیں بلکہ خدا پر توکُّل اور خدا و رسول کی اطاعت کا سبق لیں۔

پھر اُس اَخلاقی مقصد کو واضح کیا گیا ہے جس کے لیے مسلمانوں کو یہ معرکۂ حق و باطل برپا کرنا ہے، اور ان اخلاقی صفات کی توضیح کی گئی ہے جن سے اس معرکے میں انھیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

پھر مشرکین اور منافقین اور یہود اور ان لوگوں کو، جو جنگ میں قید ہو کر آئے تھے، نہایت سبق آموز انداز میں خطاب کیا گیا ہے۔

پھر اُن اموال کے متعلق، جو جنگ میں ہاتھ آئے تھے، مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ انھیں اپنا مال نہ سمجھیں بلکہ خدا کا مال سمجھیں، جو کچھ اللہ اس میں سے ان کا حصہ مقرر کرے اسے شکریے کے ساتھ قبول کر لیں، اور جو حصہ اللہ اپنے کام اور اپنے غریب بندوں کی امداد کے لیے مقرر کرے اس کو برضا ورغبت گوارا کر لیں۔

پھر قانونِ جنگ وصلح کے متعلق وہ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں جن کی توضیح اِس مرحلے میں دعوتِ اسلامی کے داخل ہو جانے کے بعد ضروری تھی، تاکہ مسلمان اپنی صلح و جنگ میں جاہلیّت کے طریقوں سے بچیں اور دنیا پر ان کی اخلاقی برتری قائم ہو، اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام اوّل روز سے اخلاق پر عملی زندگی کی بنیاد رکھنے کی جو دعوت دے رہا ہے اس کی تعبیر واقعی عملی زندگی میں کیا ہے۔

پھر اسلامی ریاست کے دستوری قانون کی بعض دفعات بیان کی گئی ہیں جن سے دارالاسلام کے مسلمان باشندوں کی آئینی حیثیت اُن مسلمانوں سے الگ کر دی گئی ہے جو دارالاسلام کے حُدود سے باہر رہتے ہوں۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ ۪ وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ① اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ

تم سے اَنفال کے متعلّق پوچھتے ہیں؟ کہو: ”یہ اَنفال تو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ہیں، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلّقات دُرست کرو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔“ سچّے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر

---

۱ – یہ اِس تبصرۂ جنگ کی عجیب تمہید ہے۔ بدر میں جو مالِ غنیمت لشکرِ قریش سے لُوٹا گیا تھا اس کی تقسیم پر مسلمانوں کے درمیان نزاع برپا ہوگئی۔ چونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں کو پہلی مرتبہ پرچمِ اسلام کے نیچے لڑنے کا اتفاق ہوا تھا، اس لیے ان کو معلوم نہ تھا کہ اس مسلک میں جنگ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق کیا ضابطہ ہے۔ کچھ ابتدائی ہدایات سورۂ بَقرہ اور سورۂ محمد میں دی جاچکی تھیں، لیکن ”تہذیبِ جنگ“ کی بنیاد ابھی رکھنی باقی تھی۔ بہت سے تمدّنی معاملات کی طرح مسلمان ابھی تک جنگ کے معاملے میں بھی اکثر پُرانی جاہلیّت ہی کے تصورات لیے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے بدر کی لڑائی میں کفار کی شکست کے بعد جن لوگوں نے جو جو کچھ مالِ غنیمت لُوٹا تھا، وہ عرب کے پُرانے طریقے کے مطابق اپنے آپ کو اس کا مالک سمجھ بیٹھے تھے۔ لیکن ایک دوسرا فریق جس نے غنیمت کی طرف رُخ کرنے کے بجائے کفار کا تعاقب کیا تھا، اس بات کا مدعی ہوا کہ اس مال میں ہمارا برابر کا حصّہ ہے، کیونکہ اگر ہم دشمن کا پیچھا کر کے اسے دُور تک بھگا نہ دیتے اور تمھاری طرح غنیمت پر ٹوٹ پڑتے تو ممکن تھا کہ دشمن پھر پلٹ کر حملہ کر دیتا اور فتح شکست سے بدل جاتی۔ ایک تیسرے فریق نے بھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہا تھا، اپنے دعاوی پیش کیے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ سب سے بڑھ کر قیمتی خدمت تو اس جنگ میں ہم نے انجام دی ہے۔ اگر ہم رسولؐ اللہ کے گرد اپنی جانوں کا حصار بنائے ہوئے نہ رہتے اور آپؐ کو کوئی گزند پہنچ جاتا تو فتح ہی کب نصیب ہوسکتی تھی کہ کوئی مالِ غنیمت ہاتھ آتا اور اس کی تقسیم کا سوال اٹھتا۔ مگر مال عملاً جس فریق کے قبضے میں تھا اس کی مِلکیّت گویا کسی ثبوت کی محتاج نہ تھی اور وہ دلیل کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ ایک امرِ واقعی اس کے زور سے بدل جائے۔ آخرِ کار اس نزاع نے تلخی کی صورت اختیار کرنی شروع کردی اور زبانوں سے دلوں تک بدمزگی پھیلنے لگی۔

یہ تھا وہ نفسیاتی موقع جسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال نازل کرنے کے لیے منتخب فرمایا اور جنگ پر اپنے تبصرے کی ابتدا اسی مسئلے سے کی۔ پھر پہلا ہی فقرہ جو ارشاد ہوا، اُسی میں سوال کا جواب موجود تھا۔ فرمایا: ''تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں؟'' یہ ان اموال کو ''غنائم'' کے بجائے ''اَنفال'' کے لفظ سے تعبیر کرنا بجائے خود مسئلے کا فیصلہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ اَنفال جمع ہے نَفل کی۔ عربی زبان میں نفل اُس چیز کو کہتے ہیں جو واجب سے یا حق سے زائد ہو۔ جب یہ تابع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ رضا کارانہ خدمت ہوتی ہے جو ایک بندہ اپنے آقا کے لیے فرض سے بڑھ کر تَطَوُّعاً بجا لاتا ہے۔ اور جب یہ متبوع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ عَطِیّہ و انعام ہوتا ہے جو آقا اپنے بندے کو اس کے حق سے زائد دیتا ہے۔ پس ارشاد کا مطلب یہ ہُوا کہ یہ ساری رَدّ وکَد، یہ نزاع، یہ پوچھ گچھ، کیا خدا کے بخشے ہوئے انعامات کے بارے میں ہو رہی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو تم لوگ اِن کے مالک و مختار کہاں بنے جا رہے ہو کہ خود ان کی تقسیم کا فیصلہ کرو۔ مال جس کا بخشا ہوا ہے وہی فیصلہ کرے گا کہ کسے دیا جائے اور کسے نہیں، اور جس کو بھی دیا جائے اسے کتنا دیا جائے۔

یہ جنگ کے سلسلے میں ایک بہت بڑی اخلاقی اصلاح تھی۔ مسلمان کی جنگ دنیا کے مادّی فائدے بٹورنے کے لیے نہیں ہے بلکہ دنیا کے اخلاقی وتمدّنی بگاڑ کو اُصولِ حق کے مطابق دُرست کرنے کے لیے ہے، جسے مجبُوراً اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہ مزاحم قوتیں دعوت وتبلیغ کے ذریعے سے اصلاح کو ناممکن بنا دیں۔ پس مصلحین کی نظر اپنے مقصد پر ہونی چاہیے، نہ کہ اُن فوائد پر جو مقصد کے لیے سعی کرتے ہوئے بطورِ انعام خدا کی عنایت سے حاصل ہوں۔ ان فوائد سے اگر ابتدا ہی میں ان کی نظر نہ ہٹا دی جائے تو بہت جلدی اَخلاقی انحطاط رونما ہو کر یہی فوائد مقصود قرار پا جائیں۔

پھر یہ جنگ کے سلسلے میں ایک بہت بڑی انتظامی اصلاح بھی تھی۔ قدیم زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ لگتا، وہی اس کا مالک قرار پاتا۔ یا پھر بادشاہ یا سپہ سالار تمام غنائم پر قابض ہو جاتا۔ پہلی صورت میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ فتح یاب فوجوں کے درمیان اموالِ غنیمت پر سخت تنافُس برپا ہو جاتا اور بسا اوقات ان کی خانہ جنگی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتی۔ دوسری صورت میں سپاہیوں کو چوری کا عارضہ لگ جاتا تھا اور وہ غنائم کو چُھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن نے انفال کو اللہ اور رسولؐ کا مال قرار دے کر پہلے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ تمام مالِ غنیمت لا کر بے کم وکاست امام کے سامنے رکھ دیا جائے اور ایک سُوئی تک چُھپا کر نہ رکھی جائے۔ پھر آگے چل کر اس مال کی تقسیم کا قانون بنا دیا کہ پانچواں حصہ خدا کے کام اور اس کے غریب بندوں کی مدد کے لیے بیت المال میں رکھ دیا جائے اور باقی چار حصّے اُس پوری فوج میں تقسیم کر دیے جائیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔ اس طرح وہ دونوں خرابیاں دُور ہو گئیں جو جاہلیّت کے طریقے میں تھیں۔

اس مَقام پر ایک لطیف نکتہ اور بھی ذہن میں رہنا چاہیے۔ یہاں انفال کے قصّے کو صرف اتنی بات کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہیں۔ تقسیم کے مسئلے کو یہاں نہیں چھیڑا گیا، تاکہ پہلے تسلیم و اطاعت مکمل ہو جائے۔ پھر چند رُکوع کے بعد بتایا گیا کہ ان اموال کو تقسیم کس طرح کیا جائے۔ اسی لیے یہاں انھیں ''انفال'' کہا گیا ہے اور رکوع ۵ میں جب تقسیم کا حکم بیان کرنے کی نوبت آئی تو انھی اموال کو ''غنائم'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ۚۖ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴ۚ كَمَاۤ اَخْرَجَكَ

لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے[۲] اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگزر ہے[۳] اور بہترین رزق ہے۔ (اِس مالِ غنیمت کے معاملے میں بھی ویسی ہی صورت پیش آرہی ہے جیسی اُس وقت پیش آئی تھی جب کہ) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ

۲- یعنی ہر ایسے موقع پر جب کہ کوئی حکم الٰہی آدمی کے سامنے آئے اور وہ اس کی تصدیق کر کے سرِ اطاعت جُھکا دے، آدمی کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر اس موقع پر جب کہ کوئی چیز آدمی کی مرضی کے خلاف، اس کی رائے اور تصورات و نظریّات کے خلاف، اس کی مانوس عادتوں کے خلاف، اس کے مفاد اور اس کی لذت و آسایش کے خلاف، اس کی محبّتوں اور دوستیوں کے خلاف اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی ہدایت میں ملے اور آدمی اس کو مان کر فرمانِ خدا و رسولؐ کو بدلنے کے بجائے اپنے آپ کو بدل ڈالے اور اس کی قبولیت میں تکلیف انگیز کر لے تو اس سے آدمی کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا کرنے میں آدمی دریغ کرے تو اس کے ایمان کی جان نکلنی شروع ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ساکن و جامد چیز نہیں ہے، اور تصدیق و عَدَمِ تصدیق کا بس ایک ہی ایک مرتبہ نہیں ہے کہ اگر آدمی نے نہ مانا تو وہ بس ایک ہی نہ ماننا رہا، اور اگر اس نے مان لیا تو وہ بھی بس ایک ہی مان لینا ہُوا۔ نہیں، بلکہ تصدیق اور انکار دونوں میں انحطاط اور نَشو و نَما کی صلاحیت ہے۔ ہر انکار کی کیفیت گھٹ بھی سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے۔ اور اسی طرح ہر اقرار و تصدیق میں ارتقا بھی ہو سکتا ہے اور تنزّل بھی۔ البتہ فقہی احکام کے اعتبار سے نظامِ تمدن میں حُقوق اور حیثیات کا تعیّن جب کیا جائے گا تو تصدیق اور عَدَمِ تصدیق دونوں کے بس ایک ہی مرتبے کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسلامی سوسائٹی میں تمام ماننے والوں کے آئینی حقوق و واجبات یکساں ہوں گے، خواہ ان کے درمیان ماننے کے مراتب میں کتنا ہی تفاوُت ہو۔ اور سب نہ ماننے والے ایک ہی مرتبے میں ذِمّی

رَبُّكَ مِنۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ ۖ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ ۙ ۝۵ يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَقِّ بَعۡدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوۡنَ اِلَى الۡمَوۡتِ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ ؕ ۝۶ وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآئِفَتَيۡنِ اَنَّهَا

تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملے میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے درآں حالے کہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں[۴]۔

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمھیں

یا حربی یا مُعاہَد و مسالم قرار دیے جائیں گے، خواہ ان میں کفر کے اعتبار سے مراتب کا کتنا ہی فرق ہو۔

۳ – قصور بڑے سے بڑے اور بہتر سے بہتر اہلِ ایمان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں، اور جب تک انسان انسان ہے، یہ محال ہے کہ اس کا نامۂ اعمال سراسر معیاری کارناموں ہی پر مشتمل ہو اور لغزش، کوتاہی، خامی سے بالکل خالی رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے یہ بھی ایک بڑی رحمت ہے کہ جب انسان بندگی کی لازمی شرائط پوری کر دیتا ہے تو اللہ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرماتا ہے اور اس کی خدمات جس صلے کی مستحق ہوتی ہیں اس سے کچھ زیادہ صلہ اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔ ورنہ اگر قاعدہ یہ مقرر کیا جاتا کہ ہر قصور کی سزا اور ہر خدمت کی جزا الگ الگ دی جائے تو کوئی بڑے سے بڑا صالح بھی سزا سے نہ بچ سکتا۔

۴ – یعنی جس طرح اُس وقت یہ لوگ خطرے کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے، حالانکہ حق کا مطالبہ اُس وقت یہی تھا کہ خطرے کے منہ میں چلے جائیں، اسی طرح آج انھیں مالِ غنیمت ہاتھ سے چھوڑنا ناگوار ہو رہا ہے، حالانکہ حق کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اسے چھوڑیں اور حکم کا انتظار کریں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ کی اطاعت کرو گے اور اپنے نفس کی خواہش کے بجائے رسولؐ کا کہا مانو گے تو ویسا ہی اچھا نتیجہ دیکھو گے جیسا ابھی جنگِ بدر کے موقع پر دیکھ چکے ہو کہ تمھیں لشکرِ قریش کے مقابلے پر جانا سخت ناگوار تھا اور اسے تم ہلاکت کا پیغام سمجھ رہے تھے، لیکن جب تم نے حکمِ خدا و رسول کی تعمیل کی تو یہی خطرناک کام تمھارے لیے زندگی کا پیغام ثابت ہوا۔

قرآن کا یہ ارشاد ضمناً اُن رِوایات کی بھی تردید کر رہا ہے جو جنگِ بدر کے سلسلے میں عموماً کُتبِ سیرت و مغازی میں نقل کی جاتی ہیں، یعنی یہ کہ ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین قافلے کو لُوٹنے کے لیے مدینے سے روانہ ہوئے تھے۔ پھر چند منزل آگے جا کر جب معلوم ہوا کہ قریش کا لشکر قافلے کی حفاظت کے لیے آ رہا ہے تب یہ مشورہ کیا گیا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے

لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷﴾ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸﴾ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿۹﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا

مل جائے گا۔[۵] تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمھیں ملے۔[۶] مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے، خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔[۷]

اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمھاری مدد کے لیے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے تمھیں صرف اس لیے بتا دی کہ تمھیں خوشخبری ہو اور تمھارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے

یا لشکر کا مقابلہ؟ اس بیان کے برعکس قرآن یہ بتا رہا ہے کہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکلے تھے، اسی وقت یہ امرِ حق آپؐ کے پیشِ نظر تھا کہ قریش کے لشکر سے فیصلہ کن مقابلہ کیا جائے۔ اور یہ مشاورت بھی اسی وقت ہوئی تھی کہ قافلے اور لشکر میں سے کس کو حملے کے لیے منتخب کیا جائے۔ اور باوجودیکہ مومنین پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ لشکر ہی سے نمٹنا ضروری ہے، پھر بھی ان میں سے ایک گروہ اس سے بچنے کے لیے حجت کرتا رہا۔ اور بالآخر جب آخری رائے یہ قرار پائی کہ لشکر ہی کی طرف چلنا چاہیے تو یہ گروہ مدینے سے یہ خیال کرتا ہوا چلا کہ ہم سیدھے موت کے منہ میں ہانکے جا رہے ہیں۔

۵ – یعنی تجارتی قافلہ یا لشکرِ قریش۔

۶ – یعنی قافلہ جس کے ساتھ صرف تیس چالیس محافظ تھے۔

۷ – اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت فی الواقع صورتِ حال کیا رونما ہو گئی تھی۔ جیسا کہ ہم نے سورہ کے دیباچے میں بیان کیا ہے، لشکرِ قریش کے نکل آنے سے دراصل سوال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ دعوتِ اسلامی اور نظامِ جاہلیت، دونوں میں سے کس کو عرب میں زندہ رہنا ہے۔ اگر مسلمان اس وقت مردانہ وار مقابلے کے لیے نہ نکلتے تو اسلام کے لیے زندگی کا کوئی موقع

مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۰﴾ اِذۡ يُغَشِّيۡكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنۡهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمۡ بِهٖ وَيُذۡهِبَ عَنۡكُمۡ رِجۡزَ الشَّيۡطٰنِ وَلِيَرۡبِطَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ وَيُثَبِّتَ بِهِ الۡاَقۡدَامَ ﴿۱۱﴾ اِذۡ يُوۡحِىۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ اَنِّىۡ مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ سَاُلۡقِىۡ فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الرُّعۡبَ فَاضۡرِبُوۡا

اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔ ع

اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا،[8] اور آسمان سے تمھارے اوپر پانی برسا رہا تھا، تاکہ تمھیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمھاری ہمّت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمھارے قدم جما دے۔[9]

اور وہ وقت جب کہ تمھارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ ”میں تمھارے ساتھ ہوں، تم اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو، میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں، پس تم ان کی

باقی نہ رہتا۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کے نکلنے اور پہلے ہی بھرپور وار میں قریش کی طاقت پر کاری چوٹ لگا دینے سے وہ حالات پیدا ہوئے جن کی بدولت اسلام کو قدم جمانے کا موقع مل گیا اور پھر اس کے مقابلے میں نظامِ جاہلیّت پیہم شکست کھاتا ہی چلا گیا۔

۸ - یہی تجربہ مسلمانوں کو اُحُد کی جنگ میں پیش آیا، جیسا کہ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۴ میں گزر چکا ہے۔ اور دونوں مواقع پر وجہ وہی ایک تھی کہ جو موقع شدتِ خوف اور گھبراہٹ کا تھا اس وقت اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو ایسے اطمینان سے بھر دیا کہ ان پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

۹ - یہ اُس رات کا واقعہ ہے جس کی صبح کو بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اس بارش کے تین فائدے ہوئے: ایک یہ کہ مسلمانوں کو پانی کی کافی مقدار مل گئی اور انھوں نے فوراً حوض بنا بنا کر بارش کا پانی روک لیا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ وادی کے بالائی حصّے پر تھے اس لیے بارش کی وجہ سے ریت جم گئی اور زمین اتنی مضبوط ہوگئی کہ قدم اچھی طرح جم سکیں اور نقل و حرکت بآسانی ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ لشکرِ کفار نشیب کی جانب تھا، اس لیے وہاں اس بارش کی بدولت کیچڑ ہوگئی اور

فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا

گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔"[10] یہ اس لیے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کیا، اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لیے نہایت سخت گیر ہے۔[11] ـــــ یہ[12] ہے تم لوگوں کی سزا، اب اس کا مزا چکھو، اور تمھیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

اے ایمان لانے والو! جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرو۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری ـــــ اِلّا یہ کہ جنگی چال کے طور پر

پاؤں دھنسنے لگے۔

شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست سے مراد وہ ہراس اور گھبراہٹ کی کیفیت تھی جس میں مسلمان ابتداءً مبتلا تھے۔

۱۰ – جو اُصولی باتیں ہم کو قرآن کے ذریعے سے معلوم ہیں، ان کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فرشتوں سے قتال میں یہ کام نہیں لیا گیا ہوگا کہ وہ خود حرب وضرب کا کام کریں، بلکہ شاید اس کی صورت یہ ہوگی کہ کفار پر جو ضرب مسلمان لگائیں وہ فرشتوں کی مدد سے ٹھیک بیٹھے اور کاری لگے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

۱۱ – یہاں تک جنگِ بدر کے جن واقعات کو ایک ایک کر کے یاد دلایا گیا ہے، اس سے مقصود دراصل لفظ "انفال" کی معنویت واضح کرنا ہے۔ ابتدا میں ارشاد ہوا تھا کہ اس مالِ غنیمت کو اپنی جانفشانی کا ثمرہ سمجھ کر اس کے مالک ومختار کہاں بنے جاتے ہو، یہ تو دراصل عطیۂ الٰہی ہے اور معطی خود ہی اپنے مال کا مختار ہے۔ اب اس کے ثبوت میں یہ واقعات گنائے گئے ہیں کہ اس فتح میں خود ہی حساب لگا کر دیکھ لو کہ تمھاری اپنی جانفشانی اور جرأت وجسارت کا کتنا حصہ تھا اور اللہ کی عنایت کا کتنا حصہ۔

لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

ایسا کرے یا کسی دُوسری فوج سے جا ملنے کے لیے ـــــ تو وہ اللہ کے غضب میں گِھر جائے گا، اُس کا ٹھکانا جہنّم ہوگا، اور وہ بہت بُری جائے بازگشت ہے۔[۱۳]

پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا، اور تُو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا[۱۴]۔ (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کیے گئے) تو یہ اس لیے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے، یقیناً اللہ سُننے اور جاننے والا ہے۔

---

۱۲ – خطاب کا رُخ یکایک کفار کی طرف پھر گیا ہے جن کے مستحقِ سزا ہونے کا ذکر اُوپر کے فقرے میں ہُوا تھا۔

۱۳ – دشمن کے شدید دباو پر مُرتّب پسپائی (orderly retreat) ناجائز نہیں ہے جب کہ اس کا مقصود اپنے عَقَبی مرکز کی طرف پلٹنا یا اپنی ہی فوج کے کسی دوسرے حصّے سے جا ملنا ہو۔ البتہ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ بھگدڑ (rout) ہے، جو کسی جنگی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض بزدلی و شکست خوردگی کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس لیے ہوا کرتی ہے کہ بھگوڑے آدمی کو اپنے مقصد کی بہ نسبت جان زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اس فرار کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی: ایک شرک، دوسرے والدین کی حق تلفی، تیسرے میدانِ قِتال فی سبیل اللہ سے فرار۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آپؐ نے سات بڑے گناہوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لیے تباہ کُن اور اس کے انجام اُخروی کے لیے غارت گر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ گناہ بھی ہے کہ آدمی کفر و اسلام کی جنگ میں کفار کے آگے پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اس فعل کو اتنا بڑا گناہ قرار دینے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ یہ ایک بُزدلانہ فعل ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کا بھگوڑا پن بسا اوقات ایک پوری پلٹن کو، اور ایک پلٹن کا بھگوڑا پن ایک پوری فوج کو بدحواس کر کے بھگا دیتا ہے۔ اور پھر جب ایک دفعہ کسی فوج میں بھگدڑ پڑ جائے تو کہا نہیں جا سکتا کہ تباہی کس حد پر جا کر ٹھیرے گی۔ اس طرح کی بھگدڑ صرف فوج ہی کے لیے تباہ کُن نہیں ہے بلکہ اُس مُلک کے لیے بھی تباہ کُن ہے جس کی فوج ایسی شکست کھائے۔

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ۚۖ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

یہ معاملہ تو تمھارے ساتھ ہے، اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔ (ان کافروں سے کہہ دو) ”اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو، فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا۔[15] اب باز آ جاؤ تو تمھارے ہی لیے بہتر ہے، ورنہ پھر پلٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی اسی سزا کا اعادہ کریں گے اور تمھاری جمعیت، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، تمھارے کچھ کام نہ آ سکے گی۔ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔“ ع

اے ایمان لانے والو! اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور حکم سُننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سُنا، حالانکہ وہ نہیں سُنتے۔[16]

---

۱۴ – معرکۂ بدر میں جب مسلمانوں اور کفار کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور عام زدوخورد کا موقع آ گیا تو حضورؐ نے مٹھی بھر ریت ہاتھ میں لے کر شاھتِ الوُجوہ کہتے ہوئے کفار کی طرف پھینکی اور اس کے ساتھ ہی آپؐ کے اشارے سے مسلمان یکبارگی کفار پر حملہ آور ہوئے۔ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵ – مکے سے روانہ ہوتے وقت مشرکین نے کعبہ کے پردے پکڑ کر دُعا مانگی تھی کہ خدایا! دونوں گروہوں میں سے جو بہتر ہے اس کو فتح عطا کر۔ اور ابوجہل نے خاص طور پر کہا تھا کہ خدایا! ہم میں سے جو برسرِ حق ہو اُسے فتح دے اور جو برسرِ ظلم ہو اُسے رسوا کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی منہ مانگی دُعائیں حرف بحرف پوری کر دیں اور فیصلہ کر کے بتا دیا کہ دونوں میں سے کون اچھا

إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ

یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ[17] ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انھیں سُننے کی توفیق دیتا، (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ ان کو سُنواتا تو وہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے۔[18]

اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسولؐ تمھیں اس چیز کی طرف بُلائے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے، اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔[19] اور بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر

اور برسرِ حق ہے۔

۱۶ – یہاں سننے سے مراد وہ سننا ہے جو ماننے اور قبول کرنے کے معنٰی میں ہوتا ہے۔ اشارہ اُن منافقین کی طرف ہے جو ایمان کا اقرار تو کرتے تھے مگر احکام کی اطاعت سے منہ موڑ جاتے تھے۔

۱۷ – یعنی جو نہ حق سنتے ہیں نہ حق بولتے ہیں۔ جن کے کان اور جن کے منہ حق کے لیے بہرے اور گونگے ہیں۔

۱۸ – یعنی جب ان لوگوں کے اندر خود حق پرستی اور حق کے لیے کام کرنے کا جذبہ نہیں ہے تو انھیں اگر تعمیلِ حکم میں جنگ کے لیے نکل آنے کی توفیق دے بھی دی جاتی تو یہ خطرے کا موقع دیکھتے ہی بے تکلّف بھاگ نکلتے اور ان کی معیّت تمھارے لیے مفید ثابت ہونے کے بجائے اُلٹی مضر ثابت ہوتی۔

۱۹ – نِفاق کی رَوِش سے انسان کو بچانے کے لیے اگر کوئی سب سے زیادہ مؤثر تدبیر ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دو عقیدے انسان کے ذہن نشین ہو جائیں: ایک یہ کہ معاملہ اُس خدا کے ساتھ ہے جو دلوں کے حال تک جانتا ہے اور ایسا رازداں ہے کہ آدمی اپنے دل میں جو نیتیں، جو خواہشیں، جو اغراض و مقاصد اور جو خیالات چھپا کر رکھتا ہے وہ بھی اس پر عیاں ہیں۔ دوسرے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ

صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو[20]۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیّا کردی، اپنی مدد سے

یہ کہ جانا بہرحال خدا کے سامنے ہے، اس سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ یہ دو عقیدے جتنے زیادہ پختہ ہوں گے اُتنا ہی انسان نِفاق سے دُور رہے گا۔ اسی لیے منافقت کے خلاف وعظ و نصیحت کے سلسلے میں قرآن اِن دو عقیدوں کا ذکر بار بار کرتا ہے۔

۲۰ – اس سے مراد وہ اجتماعی فتنے ہیں جو وبائے عام کی طرح ایسی شامت لاتے ہیں جس میں صرف گناہ کرنے والے ہی گرفتار نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو گناہ گار سوسائٹی میں رہنا گوارا کرتے رہے ہوں۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھیے کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں کہیں کہیں انفرادی طور پر چند مقامات پر رہتی ہیں، ان کا اثر محدود رہتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متأثّر ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو۔ لیکن جب وہاں گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی سارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے، تو پھر ہوا اور زمین اور پانی ہر چیز میں سَمِیَّت پھیل جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں جو وبا آتی ہے اس کی لپیٹ میں گندگی پھیلانے والے اور گندا رہنے والے اور گندے ماحول میں زندگی بسر کرنے والے سب ہی آجاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی نجاستوں کا حال بھی ہے کہ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی کے رعب سے دبی رہیں تو ان کے نقصانات محدود رہتے ہیں۔ لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے، جب اخلاقی بُرائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی، جب اس کے درمیان بُرے اور بے حیا اور بداخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو علانیہ اُچھالنے اور پھیلانے لگتے ہیں، اور جب اچھے لوگ بے عملی (passive attitude) اختیار کر کے اپنی انفرادی اچھائی پر قانع اور اجتماعی برائیوں پر ساکت و صامت ہو جاتے ہیں، تو مجموعی طور پر پوری سوسائٹی کی شامت آجاتی ہے اور وہ فتنۂ عام برپا ہوتا ہے جس میں چنے کے ساتھ گُھن بھی پس جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ رسول جس اصلاح و ہدایت کے کام کے لیے اٹھا ہے اور تمھیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کے لیے بُلا رہا ہے، اسی میں درحقیقت شخصی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تمھارے لیے زندگی ہے۔ اگر اس میں سچے دل سے مخلصانہ حصّہ نہ لو گے اور ان بُرائیوں کو جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں، برداشت کرتے رہو گے تو وہ فتنۂ عام برپا ہوگا

بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ

تمھارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمھیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکرگزار بنو۔[۲۱] اے ایمان لانے والو! جانتے بُوجھتے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں[۲۲] میں غدّاری کے مرتکب نہ ہو، اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمائش ہیں[۲۳]، اور اللہ کے

جس کی آفت سب کو لپیٹ میں لے لے گی، خواہ بہت سے افراد تمھارے درمیان ایسے موجود ہوں جو عملاً بُرائی کرنے اور بُرائی پھیلانے کے ذمّہ دار نہ ہوں، بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھلائی ہی لیے ہوئے ہوں۔ یہ وہی بات ہے جس کو سورۂ اَعراف، آیات ۱۶۳-۱۶۶ میں اصحاب السبّت کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے بیان کیا جا چکا ہے، اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جسے اسلام کی اصلاحی جنگ کا بنیادی نظریّہ کہا جا سکتا ہے۔

۲۱- یہاں شکرگزاری کا لفظ غور کے قابل ہے۔ اُوپر کے سلسلۂ تقریر کو نظر میں رکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس موقع پر شکرگزاری کا مفہُوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ لوگ اللہ کے اِس احسان کو مانیں کہ اس نے اس کمزوری کی حالت سے انھیں نکالا اور مکہ کی پُرخطر زندگی سے بچا کر امن کی جگہ لے آیا جہاں طیّبات رزق میسّر ہو رہے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی اسی شکرگزاری کے مفہُوم میں داخل ہے کہ مسلمان اُس خدا کی اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کریں جس نے یہ احسانات ان پر کیے ہیں، اور رسولؐ کے مشن میں اخلاص و جاں نثاری کے ساتھ کام کریں، اور اس کام میں جو خطرات و مہالک اور مصائب پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ اُسی خدا کے بھروسے پر کرتے چلے جائیں جس نے اس سے پہلے ان کو خطرات سے بعافیت نکالا ہے، اور یقین رکھیں کہ جب وہ خدا کا کام اخلاص کے ساتھ کریں گے تو خدا ضرور ان کا وکیل و کفیل ہوگا۔ پس شکرگزاری محض اعترافی نوعیت ہی کی مطلوب نہیں ہے بلکہ عملی نوعیت کی بھی مطلوب ہے۔ احسان کا اعتراف کرنے کے باوجود محسن کی رضا جوئی کے لیے سعی نہ کرنا اور اس کی خدمت میں مخلص نہ ہونا اور اس کے بارے میں یہ شک رکھنا کہ نہ معلوم آیندہ بھی وہ احسان کرے گا یا نہیں، ہرگز شکرگزاری نہیں ہے بلکہ الٹی ناشکری ہے۔

۲۲- ''اپنی امانتوں'' سے مراد وہ تمام ذمّہ داریاں ہیں جو کسی پر اعتبار (trust) کر کے اس کے سُپرد کی جائیں، خواہ وہ عہدِ وفا کی ذمہ داریاں ہوں، یا اجتماعی معاہدات کی، یا جماعت کے رازوں کی، یا شخصی و جماعتی اموال کی، یا کسی ایسے عہدہ و منصب کی جو کسی شخص پر بھروسا کرتے ہوئے جماعت اس کے حوالے کرے۔ (مزید تشریح کے لیے

عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾ وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ع اے ایمان لانے والو! اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمھارے لیے کسَوٹی بہم پہنچا دے[۲۴] گا اور تمھاری بُرائیوں کو تم سے دُور کر ے گا، اور تمھارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے

مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۸۸)

۲۳ - انسان کے اخلاصِ ایمانی میں جو چیز بالعُموم خلل ڈالتی ہے اور جس کی وجہ سے انسان اکثر منافقت، غداری اور خیانت میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اپنے مالی مفاد اور اپنی اولاد کے مفاد سے اس کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ مال اور اولاد، جن کی محبّت میں گرفتار ہو کر تم عُموماً راستی سے ہٹ جاتے ہو، دراصل یہ دنیا کی امتحان گاہ میں تمھارے لیے سامانِ آزمایش ہیں۔ جسے تم بیٹا یا بیٹی کہتے ہو، حقیقت کی زبان میں وہ دراصل امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اور جسے تم جائداد یا کاروبار کہتے ہو، وہ بھی درحقیقت ایک دوسرا پرچۂ امتحان ہے۔ یہ چیزیں تمھارے حوالے کی ہی اس لیے گئی ہیں کہ ان کے ذریعے سے تمھیں جانچ کر دیکھا جائے کہ تم کہاں تک حقوق اور حدود کا لحاظ کرتے ہو، کہاں تک ذمّہ داریوں کا بوجھ لادے ہوئے جذبات کی کشش کے باوجود راہِ راست پر چلتے ہو، اور کہاں تک اپنے نفس کو، جو اِن دنیوی چیزوں کی محبّت میں اسیر ہوتا ہے، اس طرح قابو میں رکھتے ہو کہ پوری طرح بندۂ حق بھی بنے رہو اور ان چیزوں کے حُقوق اس حد تک ادا بھی کرتے رہو جس حد تک حضرتِ حق نے خود ان کا استحقاق مقرر کیا ہے۔

۲۴ - کسَوٹی اُس چیز کو کہتے ہیں جو کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کو نمایاں کرتی ہے۔ یہی مفہوم "فُرقان" کا بھی ہے، اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ اس لفظ سے کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو اور تمھاری دلی خواہش یہ ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو، تو اللہ تعالیٰ تمھارے اندر وہ قوتِ تمیز پیدا کر دے گا جس سے قدم قدم پر تمھیں خود یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کون سا رَوِیّہ صحیح ہے اور کون سا غلط، کس رَوِیّے میں خدا کی رضا ہے اور کس میں اس کی ناراضی۔ زندگی کے ہر موڑ، ہر دوراہے، ہر نشیب اور ہر فراز پر تمھاری اندرونی بصیرت تمھیں بتانے لگے گی کہ کدھر قدم اُٹھانا چاہیے اور کدھر نہ اُٹھانا چاہیے، کون سی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کون سی راہ

لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ

کہ تجھے قید کردیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں۔[۲۵] وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا، اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ ”ہاں سُن لیا ہم نے، ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں، یہ تو وہی پُرانی

باطل ہے اور شیطان سے ملاتی ہے۔

۲۵ – یہ اُس موقع کا ذکر ہے جب کہ قریش کا یہ اندیشہ یقین کی حد کو پہنچ چکا تھا کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم بھی مدینہ چلے جائیں گے۔ اس وقت وہ آپس میں کہنے لگے کہ اگر یہ شخص مکے سے نکل گیا تو پھر خطرہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے آپؐ کے معاملے میں ایک آخری فیصلہ کرنے کے لیے دار النّدوَہ میں تمام رُؤسائے قوم کا ایک اجتماع کیا اور اس امر پر باہم مشاورت کی کہ اس خطرے کا سَدِّ باب کس طرح کیا جائے۔ ایک فریق کی رائے یہ تھی کہ اس شخص کو بیڑیاں پہنا کر ایک جگہ قید کر دیا جائے اور جیتے جی رہا نہ کیا جائے۔ لیکن اس رائے کو قبول نہ کیا گیا، کیونکہ کہنے والوں نے کہا کہ اگر ہم نے اسے قید کر دیا تو اس کے جو ساتھی قید خانے سے باہر ہوں گے وہ برابر اپنا کام کرتے رہیں گے، اور جب ذرا بھی قوت پکڑ لیں گے تو اسے چھڑانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہ کریں گے۔ دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ اسے اپنے ہاں سے نکال دو۔ پھر جب یہ ہمارے درمیان نہ رہے تو ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے، بہرحال اس کے وجود سے ہمارے نظامِ زندگی میں خلل پڑنا تو بند ہو جائے گا۔ لیکن اسے بھی یہ کہہ کر ردّ کر دیا گیا کہ یہ شخص جادو بیان آدمی ہے، دلوں کو موہنے میں اسے بلا کا کمال حاصل ہے، اگر یہ یہاں سے نکل گیا تو نہ معلوم عرب کے کن کن قبیلوں کو اپنا پیرو بنا لے گا اور پھر کتنی قوت حاصل کر کے قلبِ عرب کو اپنے اقتدار میں لانے کے لیے تم پر حملہ آور ہو گا۔ آخرِ کار ابو جہل نے یہ رائے پیش کی کہ ہم اپنے تمام قبیلوں میں سے ایک ایک عالی نسب تیز دست جوان منتخب کریں اور یہ سب مل کر یک بارگی محمدؐ پر ٹوٹ پڑیں اور اسے قتل کر ڈالیں۔ اس طرح محمدؐ کا خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور بنو عبدِ مَناف کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ سب سے لڑ سکیں، اس لیے مجبوراً خُوں بہا پر فیصلہ کرنے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا، قتل کے لیے آدمی بھی نامزد ہو گئے اور قتل کا وقت بھی مقرر کر دیا گیا، حتّٰی کہ جو رات اس کام کے لیے تجویز کی گئی تھی اس میں ٹھیک وقت پر قاتلوں کا گروہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچ بھی گیا، لیکن ان کا ہاتھ پڑنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر نکل گئے اور ان کی بنی بنائی تدبیر عین وقت پر ناکام ہو کر رہ گئی۔

أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣٣﴾ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

کہانیاں ہیں جو پہلے سے لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں۔" اور وہ بات بھی یاد ہے جو اُنھوں نے کہی تھی کہ "خدایا! اگر یہ واقعی حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔"[26] اُس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تُو ان کے درمیان موجود تھا۔ اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ اِستِغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے۔[27] لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجدِ حرام کا راستہ روک رہے ہیں،

۲۶ – یہ بات وہ دُعا کے طور پر نہیں کہتے تھے بلکہ چیلنج کے انداز میں کہتے تھے۔ یعنی ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر واقعی یہ حق ہوتا اور خدا کی طرف سے ہوتا تو اس کے جھٹلانے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہم پر آسمان سے پتھر برستے اور عذابِ الیم ہمارے اُوپر ٹوٹ پڑتا۔ مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ یہ نہ حق ہے نہ مِن جانبِ اللہ ہے۔

۲۷ – یہ اُن کے اس سوال کا جواب ہے جو اُن کی اُوپر والی ظاہری دعا میں مُتضمّن تھا۔ اِس جواب میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکّی دَور میں کیوں عذاب نہیں بھیجا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ جب تک نبی کسی بستی میں موجود ہو اور حق کی طرف دعوت دے رہا ہو، اس وقت تک بستی کے لوگوں کو مُہلت دی جاتی ہے اور عذاب بھیج کر قبل از وقت ان سے اصلاح پذیری کا موقع سلب نہیں کر لیا جاتا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک بستی میں سے ایسے لوگ پے در پے نکلتے چلے آ رہے ہوں جو اپنی سابقہ غفلت اور غلط روی پر مُتنبِّہ ہو کر اللہ سے معافی کی درخواست کرتے ہوں اور آیندہ کے لیے اپنے رَوِیّے کی اصلاح کر لیتے ہوں، اس وقت تک کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ اس بستی کو تباہ کر کے رکھ دے۔ البتہ عذاب کا اصلی وقت وہ ہوتا ہے جب نبی اس بستی پر حجّت پوری کرنے کے بعد مایوس ہو کر وہاں سے نکل جائے یا نکال دیا جائے یا قتل کر ڈالا جائے، اور وہ بستی اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دے کہ وہ کسی صالح عُنصر کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے

وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۳۴ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۳۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ

حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولّی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولّی تو صرف اہلِ تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں، مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے، بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں۔[28] پس اب لو، اِس عذاب کا مزا چکھو، اپنے اُس انکارِ حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔[29] جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے، وہ اپنے مال خدا کے راستے سے

تیار نہیں ہے۔

۲۸ – یہ اشارہ اس غلط فہمی کی تردید میں ہے جو لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی تھی اور جس سے عام طور پر اہلِ عرب دھوکا کھا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قریش چونکہ بیت اللہ کے مجاور اور مُتولّی ہیں اور وہاں عبادت بجالاتے ہیں، اس لیے ان پر اللہ کا فضل ہے۔ اس کے ردّ میں فرمایا کہ محض میراث میں مُجاوِرت اور تولِیَت پالینے سے کوئی شخص یا گروہ کسی عبادت گاہ کا جائز مجاور و متولّی نہیں ہوسکتا۔ جائز مُجاوِر و متولّی تو صرف خدا ترس اور پرہیز گار لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ اور اِن لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک جماعت کو، جو خالص خدا کی عبادت کرنے والی ہے، اُس عبادت گاہ میں آنے سے روکتے ہیں جو خالص خدا کی عبادت ہی کے لیے وقف کی گئی تھی۔ اس طرح یہ متولّی اور خادم بن کر رہنے کے بجائے اس عبادت گاہ کے مالک بن بیٹھے ہیں اور اپنے آپ کو اس بات کا مختار سمجھنے لگے ہیں کہ جس سے یہ ناراض ہوں اسے عبادت گاہ میں نہ آنے دیں۔ یہ حرکت ان کے ناخدا ترس اور ناپرہیز گار ہونے کی صریح دلیل ہے۔ رہی ان کی عبادت جو وہ بیت اللہ میں کرتے ہیں، تو اس کے اندر نہ خُضوع و خُشوع ہے، نہ توجہ الی اللہ ہے، نہ ذکرِ الٰہی ہے، بس ایک بے معنیٰ شور و غل اور لَہو و لَعِب ہے جس کا نام انھوں نے عبادت رکھ چھوڑا ہے۔ ایسی نام نہاد خدمتِ بیت اللہ اور ایسی جھوٹی عبادت پر آخر یہ فضلِ الٰہی کے مستحق کیسے ہوگئے اور یہ چیز انھیں عذابِ الٰہی سے کیونکر محفوظ رکھ سکتی ہے؟

۲۹ – وہ سمجھتے تھے کہ عذابِ الٰہی صرف آسمان سے پتھروں کی شکل میں یا کسی اور طرح قوائے فطرت کے ہیجان ہی کی شکل میں آیا کرتا ہے۔ مگر یہاں انھیں بتایا گیا ہے کہ جنگِ بدر میں ان کی فیصلہ کُن شکست، جس کی وجہ سے اسلام کے لیے زندگی

اللّٰہِ ؕ فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا ثُمَّ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ حَسۡرَۃً ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ ۬ۙ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِلٰی جَہَنَّمَ یُحۡشَرُوۡنَ ﴿ۙ۳۶﴾ لِیَمِیۡزَ اللّٰہُ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَ یَجۡعَلَ الۡخَبِیۡثَ بَعۡضَہٗ عَلٰی بَعۡضٍ فَیَرۡکُمَہٗ جَمِیۡعًا فَیَجۡعَلَہٗ فِیۡ جَہَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ۧ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَہُوۡا یُغۡفَرۡ لَہُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ ۚ وَ اِنۡ یَّعُوۡدُوۡا فَقَدۡ مَضَتۡ سُنَّتُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَاتِلُوۡہُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ

روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے۔ مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لیے پچھتاوے کا سبب بنیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے، پھر یہ کافر جہنّم کی طرف گھیر لائے جائیں گے، تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کرے اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے، پھر اس پلندے کو جہنّم میں جھونک دے۔ یہی لوگ اصلی دیوالیے ہیں۔[۳۰] ع

اے نبیؐ! ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کر لیا جائے گا، لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا

کا اور قدیم نظام جاہلیّت کے لیے موت کا فیصلہ ہوا ہے، دراصل ان کے حق میں اللہ کا عذاب ہی ہے۔

۳۰- اس سے بڑھ کر دیوالیہ پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان جس راہ میں اپنا تمام وقت، تمام محنت، تمام قابلیت، اور پورا سرمایۂ زندگی کھپا دے، اُس کی انتہا پر پہنچ کر اُسے معلوم ہو کہ وہ اسے سیدھی تباہی کی طرف لے آئی ہے اور اس راہ میں جو کچھ اس نے کھپایا ہے، اس پر کوئی سود یا منافع پانے کے بجائے اسے اُلٹا جرمانہ بھگتنا پڑے گا۔

لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۴۰﴾

الجزء ۱۰

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ

وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ

اللہ کے لیے ہو جائے۔[۳۱] پھر اگر وہ فتنہ سے رُک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے، اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمھارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔

اور تمھیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔[۳۲]

---

۳۱ – یہاں پھر مسلمانوں کی جنگ کے اُسی ایک مقصد کا اِعادہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۳ میں بیان کیا گیا تھا۔ اس مقصد کا سلبی جُز یہ ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور ایجابی جز یہ کہ دین بالکل اللہ کے لیے ہو جائے۔ بس یہی ایک اخلاقی مقصد ایسا ہے جس کے لیے لڑنا اہلِ ایمان کے لیے جائز بلکہ فرض ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے مقصد کی لڑائی جائز نہیں ہے اور نہ اہلِ ایمان کو زیبا ہے کہ اُس میں کسی طرح حصہ لیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حواشی ۲۰۴ و ۲۰۵)

۳۲ – یہاں اُس مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون بتایا ہے جس کے متعلق تقریر کی ابتدا میں کہا گیا تھا کہ یہ اللہ کا انعام ہے جس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کو حاصل ہے۔ اب وہ فیصلہ بیان کر دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ لڑائی کے بعد تمام سپاہی ہر طرح کا مالِ غنیمت لا کر امیر یا امام کے سامنے رکھ دیں اور کوئی چیز چھپا کر نہ رکھیں۔ پھر اس مال میں سے پانچواں حصّہ اُن اغراض کے لیے نکال لیا جائے جو آیت میں بیان ہوئی ہیں، اور باقی چار حصّے ان سب لوگوں میں تقسیم کر دیے جائیں جنھوں نے جنگ میں حصّہ لیا ہو۔ چنانچہ اس آیت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہمیشہ لڑائی کے بعد اعلان فرمایا کرتے تھے کہ ان ھٰذہ غنائمکم وانہ لیس لی فیھا الا نصیبی معکم الخمس والخمس مردود علیکم فادوا الخیط والمخیط واکبر من ذٰلك واصغر ولا تغلوا فان الغلول عار ونار۔ ”یہ غنائم تمھارے ہی لیے ہیں، میری اپنی ذات کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہے، بجز خُمس کے، اور وہ خُمس بھی تمھارے ہی اجتماعی مَصالح پر صَرف کر دیا جاتا ہے۔ لٰہذا ایک ایک سُوئی اور ایک ایک تاگا تک لا کر رکھ دو، کوئی چھوٹی یا بڑی چیز چھپا کر نہ رکھو کہ ایسا کرنا شرمناک ہے اور اس کا

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ

اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز، یعنی دونوں فوجوں کی مڈ بھیڑ کے دن، ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی،[۳۳] (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو)۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یاد کرو وہ وقت جب کہ تم وادی کے اس جانب تھے اور وہ دُوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا۔ اگر کہیں پہلے سے تمھارے اور ان کے درمیان مقابلے کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلوتہی کر جاتے، لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لیے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا اسے ظُہور میں لے آئے تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ ہلاک ہو

نتیجہ دوزخ ہے۔"

اس تقسیم میں اللہ اور رسولؐ کا حصہ ایک ہی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ خُمس کا ایک جُز اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دینِ حق کے کام میں صَرف کیا جائے۔

رشتہ داروں سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو حضورؐ ہی کے رشتہ دار تھے، کیونکہ جب آپؐ اپنا سارا وقت دین کے کام میں صرف فرماتے تھے اور اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپؐ کے لیے ممکن نہ رہا تھا، تو لامحالہ اِس کا انتظام ہونا چاہیے تھا کہ آپؐ کی اور آپؐ کے اہل وعیال اور اُن دوسرے اقربا کی، جن کی کفالت آپؐ کے ذمّے تھی، ضروریات پوری ہوں۔ اس لیے خُمس میں آپؐ کے اقربا کا حصہ رکھا گیا۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد ذَوِی القُربیٰ کا یہ حصّہ کس کو پہنچتا ہے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حصہ منسُوخ ہو گیا۔ دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ حضورؐ کے بعد یہ حصہ اس شخص کے اقربا کو پہنچے گا جو حضورؐ کی جگہ خلافت کی خدمت انجام دے۔ تیسرے گروہ کے نزدیک یہ حصّہ خاندانِ نبوت کے فُقرا میں تقسیم کیا جاتا رہے گا۔ جہاں تک مَیں تحقیق کر سکا ہوں، خلفائے راشدین کے زمانے میں اسی تیسری رائے پر عمل ہوتا تھا۔

وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ

اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ زندہ رہے[۳۴]، یقیناً خدا سُننے اور جاننے والا ہے[۳۵]۔

اور یاد کرو وہ وقت جب کہ اے نبیؐ! خدا اُن کو تمھارے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا[۳۶]۔ اگر کہیں وہ تمھیں اُن کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملے میں جھگڑا شروع کر دیتے، لیکن اللہ ہی نے اِس سے تمھیں بچایا، یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔

اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمھیں کم کر کے پیش کیا، تاکہ جو بات ہونی تھی اُسے اللہ ظہُور میں لے آئے،

۳۳- یعنی وہ تائید و نصرت جس کی بدولت تمھیں فتح حاصل ہوئی۔

۳۴- یعنی ثابت ہو جائے کہ جو زندہ رہا اُسے زندہ ہی رہنا چاہیے تھا، اور جو ہلاک ہوا اسے ہلاک ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہاں زندہ رہنے والے اور ہلاک ہونے والے سے مراد افراد نہیں ہیں بلکہ اسلام اور جاہلیت ہیں۔

۳۵- یعنی خدا اندھا، بہرا، بے خبر خدا نہیں ہے بلکہ دانا و بینا ہے۔ اس کی خدائی میں اندھا دُھند کام نہیں ہو رہا ہے۔

۳۶- یہ اس وقت کی بات ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر مدینے سے نکل رہے تھے یا راستے میں کسی منزل پر تھے اور یہ متحقق نہ ہُوا تھا کہ کفار کا لشکر فی الواقع کتنا ہے۔ اس وقت حضورؐ نے خواب میں اس لشکر کو دیکھا اور جو منظر آپؐ کے سامنے پیش کیا گیا اس سے آپؐ نے اندازہ لگایا کہ دشمنوں کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہی خواب آپؐ نے مسلمانوں کو سُنا دیا اور اس سے ہمت پا کر مسلمان آگے بڑھتے چلے گئے۔

ع ۷

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ

اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔ ع

اے ایمان لانے والو! جب کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اور اس کے رسُولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو[۳۷]، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور اُن لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اِتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔[۳۸]

۳۷- یعنی اپنے جذبات و خواہشات کو قابو میں رکھو۔ جلد بازی، گھبراہٹ، ہراس، طمع اور نامناسب جوش سے بچو۔ ٹھنڈے دل اور جچی تلی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرو۔ خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمھارے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ و غضب کا ہیجان تم سے کوئی بے محل حرکت سرزد نہ کرانے پائے۔ مصائب کا حملہ ہو اور حالات بگڑتے نظر آ رہے ہوں تو اضطراب میں تمھارے حواس پراگندہ نہ ہو جائیں۔ حصولِ مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا کسی نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمھارے ارادے شتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں۔ اور اگر کبھی دنیوی فوائد و منافع اور لذاتِ نفس کی ترغیبات تمھیں اپنی طرف لُبھا رہی ہوں تو ان کے مقابلے میں بھی تمھارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاؤ۔ یہ تمام مفہومات صرف ایک لفظ ''صبر'' میں پوشیدہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ان تمام حیثیات سے صابر ہوں، میری تائید انھی کو حاصل ہے۔

۳۸- اشارہ ہے کفارِ قریش کی طرف، جن کا لشکر مکے سے اس شان سے نکلا تھا کہ گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں، جگہ جگہ ٹھیر کر رقص و سرود اور شراب نوشی کی محفلیں برپا کرتے جا رہے تھے، جو جو قبیلے اور قریے راستے میں ملتے تھے

وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ

جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور یہ کہ میں تمھارے ساتھ ہوں مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ اُلٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ

ان پر اپنی طاقت وشوکت اور اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے سروسامان کا رعب جماتے تھے اور ڈینگیں مارتے تھے کہ بھلا ہمارے مقابلے میں کون سر اُٹھا سکتا ہے۔ یہ تو تھی ان کی اخلاقی حالت۔ اور اس پر مزید لعنت یہ تھی کہ ان کے نکلنے کا مقصد ان کے اخلاق سے بھی زیادہ ناپاک تھا۔ وہ اس لیے جان ومال کی بازی لگانے نہیں نکلے تھے کہ حق اور راستی اور انصاف کا عَلَم بلند ہو، بلکہ اس لیے نکلے تھے کہ ایسا نہ ہونے پائے، اور وہ اکیلا گروہ بھی جو دنیا میں اس مقصدِ حق کے لیے اٹھا ہے ختم کر دیا جائے، تاکہ اس عَلَم کو اُٹھانے والا دنیا بھر میں کوئی نہ رہے۔ اس پر مسلمانوں کو مُتنبّہ کیا جا رہا ہے کہ تم کہیں ایسے نہ بن جانا۔ تمھیں اللہ نے ایمان اور حق پرستی کی جو نعمت عطا کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمھارے اخلاق بھی پاکیزہ ہوں اور تمھارا مقصدِ جنگ بھی پاک ہو۔

یہ ہدایت اُسی زمانے کے لیے نہ تھی، آج کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ کفار کی فوجوں کا جو حال اُس وقت تھا وہی آج بھی ہے۔ قحبہ خانے اور فواحش کے اڈّے اور شراب کے پیپے ان کے ساتھ جُزوِ لاینفک کی طرح لگے رہتے ہیں۔ خفیہ طور پر نہیں بلکہ عَلَی الاعلان نہایت بے شرمی کے ساتھ وہ عورتوں اور شراب کا زیادہ سے زیادہ راشن مانگتے ہیں، اور ان کے سپاہیوں کو خود اپنی قوم ہی سے یہ مطالبہ کرنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی شہوات کا کھلونا بننے کے لیے پیش کرے۔ پھر بھلا کوئی دوسری قوم اِن سے کیا اُمید کر سکتی ہے کہ یہ اس کو اپنی اخلاقی گندگی کی سنڈاس بنانے میں کوئی کسر اُٹھا رکھیں گے۔ رہا ان کا تکبّر اور تفاخر، تو ان کے ہر سپاہی اور ہر افسر کی چال ڈھال اور اندازِ گفتگو میں وہ نمایاں دیکھا جا سکتا ہے، اور ان میں سے ہر قوم کے مدبرین کی تقریروں میں لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کی ڈینگیں سُنی جا سکتی ہیں۔ ان اخلاقی نجاستوں سے زیادہ ناپاک ان کے مقاصدِ جنگ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نہایت مکّاری کے ساتھ دنیا کو یقین دلاتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر انسانیت کی فلاح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر درحقیقت ان کے پیشِ نظر ایک فلاحِ انسانیت ہی نہیں ہے، باقی سب کچھ ہے۔ ان کی لڑائی کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی زمین میں جو کچھ سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے، اس پر تنہا

إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾ إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ غَرَّ هَٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۗ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ

میرا تمھارا ساتھ نہیں ہے، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے، مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ؑ جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے، کہہ رہے تھے کہ اِن لوگوں کو تو اِن کے دین نے خبط میں مُبتلا کر رکھا ہے[۳۹]۔ حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔ کاش! تم اُس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی رُوحیں قبض کر رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں اور ان کے کولھوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: ''لو اب جلنے کی سزا بھگتو، یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمھارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیّا کر رکھا تھا، ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا

ان کی قوم مُتصرّف ہو اور دوسرے اس کے چاکر اور دست نگر بن کر رہیں۔ پس اہلِ ایمان کو قرآن کی یہ دائمی ہدایت ہے کہ اِن فُسّاق و فُجّار کے طور طریقوں سے بھی بچیں اور اُن ناپاک مقاصد میں بھی اپنی جان و مال کھپانے سے پرہیز کریں جن کے لیے یہ لوگ لڑتے ہیں۔

۳۹- یعنی مدینہ کے منافقین اور وہ سب لوگ جو دنیا پرستی اور خدا سے غفلت کے مرض میں گرفتار تھے، یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت قریش جیسی زبردست طاقت سے ٹکرانے کے لیے جا رہی ہے، آپس میں کہتے تھے کہ یہ لوگ اپنے دینی جوش میں دیوانے ہو گئے ہیں، اس معرکے میں ان کی تباہی یقینی ہے، مگر اس نبیؐ نے کچھ ایسا افسوں ان پر پھونک رکھا ہے کہ ان کی عقل خبط ہو گئی ہے اور آنکھوں دیکھے یہ موت کے منہ میں چلے جا رہے ہیں۔

لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ

نہیں ہے۔" یہ معاملہ ان کے ساتھ اُسی طرح پیش آیا جس طرح آلِ فرعون اور ان سے پہلے کے دُوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اللہ کی اِس سنّت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو، جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی[۴۰]۔ اللہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، وہ اسی ضابطے کے مطابق تھا۔ انھوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں ہلاک کیا اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔

یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ (خُصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے

---

۴۰ – یعنی جب تک کوئی قوم اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی نعمت کا غیر مستحق نہیں بنا دیتی، اللہ اس سے اپنی نعمت

مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ

ساتھ تُو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے[41]۔ پس اگر یہ لوگ تمھیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد جو دُوسرے لوگ ایسی روش

سلب نہیں کیا کرتا۔

۴۱ - یہاں خاص طور پر اشارہ ہے یہود کی طرف۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ طیّبہ میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے انھی کے ساتھ حُسنِ جوار اور باہمی تعاون و مددگاری کا معاہدہ کیا تھا اور اپنی حد تک پوری کوشش کی تھی کہ ان سے خوش گوار تعلقات قائم رہیں۔ نیز دینی حیثیت سے بھی آپؐ یہود کو مشرکین کی بہ نسبت اپنے سے قریب تر سمجھتے تھے اور ہر معاملے میں مشرکین کے بالمقابل اہلِ کتاب ہی کے طریقے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن اُن کے علما اور مشائخ کو توحیدِ خالص اور اخلاقِ صالحہ کی وہ تبلیغ اور اعتقادی و عملی گمراہیوں پر وہ تنقید اور اقامتِ دینِ حق کی وہ سعی، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، ایک آن نہ بھاتی تھی، اور ان کی پیہم کوشش یہ تھی کہ یہ نئی تحریک کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔ اسی مقصد کے لیے وہ مدینے کے منافق مسلمانوں سے ساز باز کرتے تھے۔ اسی کے لیے وہ اَوس اور خَزرَج کے لوگوں میں ان پُرانی عداوتوں کو بھڑکاتے تھے جو اسلام سے پہلے ان کے درمیان کُشت و خون کی موجب ہُوا کرتی تھیں۔ اسی کے لیے قریش اور دوسرے مخالفِ اسلام قبیلوں سے ان کی خفیہ سازشیں چل رہی تھیں، اور یہ سب حرکات اُس معاہدۂ دوستی کے باوجود ہو رہی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان لکھا جا چکا تھا۔ جب جنگِ بدر واقع ہوئی تو ابتدا میں ان کو توقع تھی کہ قریش کی پہلی ہی چوٹ اس تحریک کا خاتمہ کر دے گی۔ لیکن جب نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف نکلا تو اُن کے سینوں کی آتشِ حسد اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ انھوں نے اس اندیشے سے کہ بدر کی فتح کہیں اسلام کی طاقت کو ایک مستقل ”خطرہ“ نہ بنا دے، اپنی مخالفانہ کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ حتّٰی کہ اُن کا ایک لیڈر کَعب بن اشرف (جو قریش کی شکست سنتے ہی چیخ اُٹھا تھا کہ آج زمین کا پیٹ ہمارے لیے اُس کی پیٹھ سے بہتر ہے) خود مکہ گیا اور وہاں اس نے ہیجان انگیز مرثیے کہہ کہہ کر قریش کو انتقام کا جوش دلایا۔ اس پر بھی ان لوگوں نے بس نہ کی۔ یہودیوں کے قبیلۂ بنی قَینُقاع نے معاہدۂ حُسنِ جوار کے خلاف ان مسلمان عورتوں کو چھیڑنا شروع کیا جو ان کی بستی میں کسی کام سے جاتی تھیں۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حرکت پر ملامت کی تو انھوں نے جواب میں دھمکی دی کہ ”یہ قریش نہ باشد، ہم لڑنے مرنے والے لوگ ہیں اور لڑنا جانتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں آؤ گے تب تمھیں پتا چلے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔“

مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ ع وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ

اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں[۴۲]۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اِس انجام سے وہ سبق لیں گے۔ اور اگر کبھی تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو[۴۳]، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ منکرینِ حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے،

۴۲ — اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم سے ہمارا معاہدہ ہو اور پھر وہ اپنی معاہدانہ ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈال کر ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصّہ لے، تو ہم بھی معاہدے کی اخلاقی ذمہ داریوں سے سُبک دوش ہو جائیں گے اور ہمیں حق ہوگا کہ اس سے جنگ کریں۔ نیز اگر کسی قوم سے ہماری لڑائی ہو رہی ہو اور ہم دیکھیں کہ دشمن کے ساتھ ایک ایسی قوم کے افراد بھی شریکِ جنگ ہیں جس سے ہمارا معاہدہ ہے، تو ہم ان کو قتل کرنے اور ان سے دشمن کا سا معاملہ کرنے میں ہرگز کوئی تأمّل نہ کریں گے، کیونکہ انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی قوم کے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اِس کا مستحق نہیں رہنے دیا ہے کہ ان کی جان و مال کے معاملے میں اس معاہدے کا احترام ملحوظ رکھا جائے جو ہمارے اور ان کی قوم کے درمیان ہے۔

۴۳ — اس آیت کی رُو سے ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرزِ عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے، یا یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا، تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہا اور یکایک اس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فریقِ ثانی کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمھارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا، تاکہ فسخِ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے، ویسا ہی اس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔ اسی فرمانِ الٰہی کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اُصول قرار دیا تھا کہ من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عقدہ حتی ینقضی امدھا او ینبذ الیھم علی سواء۔ ”جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو، اسے چاہیے کہ معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔ یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔“ پھر اسی قاعدے کو آپؐ نے اور زیادہ پھیلا کر تمام معاملات میں عام اُصول یہ قائم کیا تھا کہ لا تخن من خانک۔ ”جو تجھ سے خیانت کرے تُو اس سے

خیانت نہ کر۔" اور یہ اُصول صرف وعظوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کے لیے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہؓ نے اپنے عہدِ بادشاہی میں سرحدِ روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاہدے کی مدّت ختم ہوتے ہی یکایک رُومی علاقے پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی اس کارروائی پر عَمرؓو بن عَنبَسَہ صحابی نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حدیث سُنا کر کہا کہ معاہدے کی مدّت کے اندر یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا غداری ہے۔ آخرِ کار امیر معاویہؓ کو اُس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا اور سرحد پر اجتماعِ فوج روک دیا گیا۔

یک طرفہ فسخِ معاہدہ اور اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانۂ حال کی مہذَّب جاہلیّت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگِ عظیم دوم میں رُوس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف رُوس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عُموماً اس کارروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملے سے پہلے مُطّلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اُٹھا لیتا۔ لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کے لیے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مَصلَحت بیان کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے اُن بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے، اور وہ صورت یہ ہے کہ فریقِ ثانی علی الاعلان معاہدے کو توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیتِ مذکورۂ بالا کے مطابق فسخِ معاہدہ کا نوٹس دیں، بلکہ ہمیں اِس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے یہ اِستِثنائی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب بنی خُزاعہ کے معاملے میں صلحِ حُدَیبیہ کو عَلانِیَہ توڑ دیا تو آپؐ نے پھر انھیں فسخِ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی، بلکہ بلا اطلاع مکے پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قاعدۂ استثنا سے فائدہ اُٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام حالات ہمارے پیشِ نظر رہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کارروائی کی تھی، تا کہ پیروی ہو تو آپؐ کے پورے طرزِ عمل کی ہو، نہ کہ اس کے کسی ایک مفید مطلب جُز کی۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ:

اوّلاً، قریش کی خلاف ورزیِ عہد ایسی صریح تھی کہ اس کے نَقضِ عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انھوں نے خود ابو سفیان کو تجدیدِ عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا، جس کے صاف معنٰی یہی تھے کہ اُن کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقضِ عہد قوم کو خود بھی اپنے نَقضِ عہد کا اعتراف ہو۔ البتہ یہ یقیناً ضروری ہے کہ نقضِ عہد بالکل صریح اور غیر مُشتَبَہ ہو۔

ثانیاً، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحتاً یا اشارتاً و کنایتاً ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایما نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپؐ ابھی تک اُن کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور

إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾

یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔

اور تم لوگ، جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلے کے لیے مہیّا رکھو[۴۴] تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دُوسرے اعدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے، اس کا پورا پورا بدل تمھاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمھارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

ان کے ساتھ آپؐ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آکر تجدیدِ معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً: قریش کے خلاف جنگی کارروائی آپؐ نے خود کی اور کھُلّم کھُلّا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپؐ کے طرزِ عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپؐ نے بظاہر صلح اور بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔

یہ اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حَسَنہ ہے، لہٰذا آیتِ مذکورۂ بالا کے حکمِ عام سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے تو ایسے ہی مخصوص حالات میں کی جاسکتی ہے اور اسی سیدھے شریفانہ طریقے سے کی جاسکتی ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید برآں اگر کسی معاہِد قوم سے کسی معاملے میں ہماری نزاع ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گفت و شنید یا بین الاقوامی ثالثی کے ذریعے سے وہ نزاع طے نہیں ہوتی، یا یہ کہ فریقِ ثانی اس کو بزور طے کرنے پر تُلا ہُوا ہے، تو ہمارے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ ہم اس کو طے کرنے میں طاقت استعمال کریں۔ لیکن آیتِ مذکورۂ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استعمالِ طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہیے اور کھُلّم کھُلّا ہونا چاہیے۔ چوری چھُپے ایسی جنگی کارروائیاں کرنا جن کا عَلانیہ اقرار کرنے کے لیے ہم تیار نہ ہوں، ایک بد اخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔

۴۴ — اس سے مطلب یہ ہے کہ تمھارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج (standing army) ہر وقت

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ۙ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ

اور اے نبیؐ! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو، یقیناً وہی سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمھارے لیے اللہ کافی ہے[۴۵]۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دُوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ تم رُوئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو اِن لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے، مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے[۴۶]، یقیناً وہ

تیار رہنی چاہیے تا کہ بوقتِ ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضا کار اور اسلحہ اور سامان رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو، دشمن اپنا کام کر جائے۔

۴۵- یعنی بین الاقوامی معاملات میں تمھاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ خدا کے بھروسے پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے، بے تکلّف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلح نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہرحال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیّت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خوں ریزی کو طول کیوں دو۔ اور اگر وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تمھیں خدا کے بھروسے پر بہادر ہونا چاہیے۔ صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تا کہ تمھاری اخلاقی برتری ثابت ہو، اور لڑائی کے لیے اُٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوتِ بازو سے توڑ کر پھینک دو تا کہ کبھی کوئی غدار قوم تمھیں نرم چارا سمجھنے کی جرأت نہ کرے۔

۴۶- اشارہ ہے اُس بھائی چارے اور اُلفت و محبّت کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے اہلِ عرب کے درمیان پیدا کر کے ان کو ایک مضبوط جتھّا بنا دیا تھا، حالانکہ اس جتھّے کے افراد اُن مختلف قبیلوں سے نکلے ہوئے تھے جن کے درمیان

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ

بڑا زبردست اور دانا ہے۔ اے نبیؐ! تمھارے لیے اور تمھارے پیرو اہلِ ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے۔ع

اے نبیؐ! مومنوں کو جنگ پر اُبھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرینِ حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے، کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔[47] اچھا، اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں

صدیوں سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں۔ خُصوصیّت کے ساتھ اللہ کا یہ فضل اَوس و خَزرَج کے معاملے میں تو سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہ دونوں قبیلے دو ہی سال پہلے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور مشہور جنگِ بُعاث کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے، جس میں اَوس نے خَزرَج کو اور خَزرَج نے اَوس کو گویا صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ ایسی شدید عداوتوں کو دو تین سال کے اندر گہری دوستی و برادری میں تبدیل کر دینا اور ان متنافر اجزا کو جوڑ کر ایسی ایک بُنیانِ مَرصوص بنا دینا جیسی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی جماعت تھی، یقیناً انسان کی طاقت سے بالاتر تھا اور دنیوی اسباب کی مدد سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہماری تائید و نصرت نے یہ کچھ کر دکھایا ہے تو آیندہ بھی تمھاری نظر دنیوی اسباب پر نہیں بلکہ خدا کی تائید پر ہونی چاہیے، کہ جو کچھ کام بنے گا اسی سے بنے گا۔

۴۷ – آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو قوتِ معنوی یا قوتِ اخلاقی (morale) کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی کو فقہ و فہم اور سمجھ بُوجھ (understanding) سے تعبیر کیا ہے، اور یہ لفظ اس مفہوم کے لیے جدید اصطلاح سے زیادہ سائنٹفک ہے۔ جو شخص اپنے مقصد کا صحیح شعور رکھتا ہو اور ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر اس لیے لڑ رہا ہو کہ جس چیز کے لیے وہ جان کی بازی لگانے آیا ہے، وہ اس کی انفرادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے ضائع ہو جانے کے بعد جینا بے قیمت ہے،

ضَعۡفًا ؕ فَاِنۡ یَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ۚ وَ اِنۡ یَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ اَلۡفٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَیۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰی حَتّٰی یُثۡخِنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ تُرِیۡدُوۡنَ عَرَضَ الدُّنۡیَا ۖۗ وَاللّٰهُ یُرِیۡدُ

کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں [۴۸] گے، اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

کسی نبیؐ کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر

وہ بے شعوری کے ساتھ لڑنے والے آدمی سے کئی گنی زیادہ طاقت رکھتا ہے، اگرچہ جسمانی طاقت میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔ پھر جس شخص کو حقیقت کا شعور حاصل ہو، جو اپنی ہستی اور خدا کی ہستی اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق اور حیاتِ دنیا کی حقیقت اور موت کی حقیقت اور حیات بعدِ موت کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہو، اور جسے حق اور باطل کے فرق اور غلبۂ باطل کے نتائج کا بھی صحیح اِدراک ہو، اس کی طاقت کو تو وہ لوگ بھی نہیں پہنچ سکتے جو قومیّت یا وطنیّت یا طبقاتی نزاع کا شعور لیے ہوئے میدان میں آئیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ ایک سمجھ بُوجھ رکھنے والے مومن اور ایک کافر کے درمیان حقیقت کے شعور اور عدمِ شعور کی وجہ سے فطرتاً ایک اور دس کی نسبت ہے۔ لیکن یہ نسبت صرف سمجھ بُوجھ سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ صبر کی صفت بھی ایک لازمی شرط ہے۔

۴۸ - اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ایک اور دس کی نسبت تھی اور اب چونکہ تم میں کمزوری آ گئی ہے اس لیے ایک اور دو کی نسبت قائم کر دی گئی ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اصولی اور معیاری حیثیت سے تو اہلِ ایمان اور کفار کے درمیان ایک اور دس ہی کی نسبت ہے، لیکن چونکہ ابھی تم لوگوں کی اَخلاقی تربیّت مکمل نہیں ہوئی ہے اور ابھی تک تمھارا شعور اور تمھاری سمجھ بُوجھ کا پیمانہ بلوغ کی حد کو نہیں پہنچا ہے، اس لیے سرِدست بر سبیلِ تنزّل تم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے سے دوگنی طاقت سے ٹکرانے میں تو تمھیں کوئی تأمّل نہ ہونا چاہیے۔ خیال رہے کہ یہ ارشاد ۲ ھ کا ہے جب کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ابھی تازہ تازہ ہی داخلِ اسلام ہوئے تھے اور ان کی تربیّت ابتدائی حالت میں تھی۔ بعد میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں یہ لوگ پختگی کو پہنچ گئے تو فی الواقع ان کے اور کفار کے درمیان ایک اور دس ہی کی نسبت قائم ہو گئی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عہد اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے کی لڑائیوں میں بارہا اس کا تجربہ ہُوا ہے۔

الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾ ع

آخرت ہے، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔[49] یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

---

۴۹ - اس آیت کی تفسیر میں اہلِ تاویل نے جو روایات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں کہ جنگِ بدر میں لشکرِ قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے تھے، ان کے متعلق بعد میں مشورہ ہُوا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے رائے دی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ قتل کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے قبول کی اور فدیے کا معاملہ طے کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات بطورِ عتاب نازل فرمائیں۔ مگر مفسرین آیت کے اس فقرے کی کوئی معقول تاویل نہیں کر سکے ہیں کہ ”اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا“۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد تقدیرِ الٰہی ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ ارادہ فرما چکا تھا کہ مسلمانوں کے لیے غنائم کو حلال کر دے گا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک وحیِ تشریعی کے ذریعے سے کسی چیز کی اجازت نہ دی گئی ہو، اس کا لینا جائز نہیں ہو سکتا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت پوری اسلامی جماعت اس تاویل کی رُو سے گناہ گار قرار پاتی ہے اور ایسی تاویل کو اخبارِ آحاد کے اعتماد پر قبول کر لینا ایک بڑی ہی سخت بات ہے۔

میرے نزدیک اس مقام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے سورۂ محمد میں جنگ کے متعلق جو ابتدائی ہدایات دی گئی تھیں، ان میں یہ ارشاد ہُوا تھا کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (آیت ۴)۔ اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت تو دے دی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے۔ اس فرمان کی رُو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد ان سے جو فدیہ وُصول کیا، وہ تھا تو اجازت کے مطابق، مگر غلطی یہ ہوئی کہ ”دشمن کی طاقت کو کچل دینے“ کی جو شرط مقدّم رکھی گئی تھی اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت لُوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا کچھ دُور تک تعاقب کیا۔ حالاں کہ اگر مسلمان پوری طاقت سے اُن کا تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اُسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ عتاب فرما رہا ہے، اور یہ عتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۰ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

اے نبیؐ! تم لوگوں کے قبضے میں جو قیدی ہیں ان سے کہو: اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمھارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمھیں اُس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھاری خطائیں معاف کرے گا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انھیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آ گئے، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم ہے۔

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے

فرمانِ مبارک کا منشا یہ ہے کہ ”تم لوگ ابھی نبی کے مشن کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہو۔ نبیؐ کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ فدیے اور غنائم وصول کر کے خزانے بھرے، بلکہ اس کے نصب العین سے جو چیز براہِ راست تعلق رکھتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے۔ مگر تم لوگوں پر بار بار دنیا کا لالچ غالب ہو جاتا ہے۔ پہلے دشمن کی اصل طاقت کے بجائے قافلے پر حملہ کرنا چاہا، پھر دشمن کا سر کچلنے کے بجائے غنیمت لُوٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے، پھر غنیمت پر جھگڑنے لگے۔ اگر ہم پہلے فدیہ وصول کرنے کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو اس پر تمھیں سخت سزا دیتے۔ خیر اب جو کچھ تم نے لیا ہے وہ کھا لو، مگر آیندہ ایسی رَوِش سے بچتے رہو جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔“ میں اس رائے پر پہنچ چکا تھا کہ امام جصّاص کی کتاب ”احکام القرآن“ میں یہ دیکھ کر مجھے مزید اطمینان حاصل ہوا کہ امامِ موصوف بھی اس تاویل کو کم از کم قابلِ لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں۔ پھر سیرت ابنِ ہِشَام میں یہ روایت نظر سے گزری کہ جس وقت مجاہدینِ اسلام مالِ غنیمت لُوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگے ہُوئے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت سعدؓ بن مُعاذ کے چہرے پر کچھ کراہت کے آثار ہیں۔ حضوؐر نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”اے سعد! معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی یہ کارروائی تمھیں پسند نہیں آ رہی ہے۔“ انھوں نے عرض کیا: ”جی ہاں، یا رسولؐ اللہ! یہ پہلا معرکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ

وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ

مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کرکے (دار الاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمھارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کرکے نہ آجائیں[۵۰]۔ ہاں اگر وہ

نے اہلِ شرک کو شکست دلوائی ہے، اس موقع پر انھیں قیدی بنا کر ان کی جانیں بچالینے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ان کو خوب کچل ڈالا جاتا۔'' (جلد ۲، صفحہ ۲۸۰-۲۸۱)

۵۰ – یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک اہم دفعہ ہے۔ اس میں یہ اُصول مقرر کیا گیا ہے کہ ''ولایت'' کا تعلق صرف اُن مسلمانوں کے درمیان ہوگا جو یا تو دار الاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر باہر سے آئیں تو ہجرت کرکے آجائیں۔ باقی رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حُدودِ ارضی سے باہر ہوں، تو اُن کے ساتھ مذہبی اخوت تو ضرور قائم رہے گی، لیکن ''ولایت'' کا تعلق نہ ہوگا، اور اسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلقِ ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کرکے نہ آئیں بلکہ دار الکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے دار الاسلام میں آئیں۔ ''ولایت'' کا لفظ عَرَبی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور اس آیت کے سِیاق وسَباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے، اور شہریوں کا اپنی ریاست سے، اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت ''دستوری و سیاسی ولایت'' کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے، اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتے سے خارج قرار دیتی ہے۔ اِس عَدَمِ ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اسی عَدَمِ ولایت کی بنا پر دار الکفر اور دار الاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے، ایک دوسرے کے قانونی ولی (guardian) نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کرسکتے، اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دار الکفر سے شہریّت کا تعلق نہ توڑا ہو۔ علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رُو سے دولتِ اسلامیہ کی ذمہ داری اُن مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کے حدود کے اندر رہتے ہیں۔ باہر کے مسلمانوں کے لیے کسی ذمہ داری کا بار اس کے سر نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ انا برئ من کل مسلم بین ظھرانی المشرکین۔

اسۡتَنۡصَرُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ فَعَلَيۡكُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا

دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو[۵۱]۔ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھتا ہے۔ جو لوگ منکرِ حق ہیں

''میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت وحفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔'' اِس طرح اسلامی قانون نے اُس جھگڑے کی جڑ کاٹ دی ہے جو بالعُموم بین الاقوامی پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض اقلیتوں کا ذمہ اپنے سر لے لیتی ہے تو اس کی وجہ سے ایسی اُلجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لڑائیاں بھی نہیں سُلجھا سکتیں۔

۵۱ - اُوپر کی آیت میں دار الاسلام سے باہر رہنے والے مسلمانوں کو ''سیاسی ولایت'' کے رشتے سے خارج قرار دیا گیا تھا۔ اب یہ آیت اس امر کی توضیح کرتی ہے کہ اس رشتے سے خارج ہونے کے باوجود وہ ''دینی اخوت'' کے رشتے سے خارج نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ اسلامی برادری کے تعلق کی بنا پر دار الاسلام کی حکومت اور اس کے باشندوں سے مدد مانگیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مدد کریں۔ لیکن اس کے بعد مزید توضیح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان دینی بھائیوں کی مدد کا فریضہ اندھا دُھند انجام نہیں دیا جائے گا، بلکہ بین الاقوامی ذمہ داریوں اور اخلاقی حدود کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے ہی انجام دیا جا سکے گا۔ اگر ظلم کرنے والی قوم سے دار الاسلام کے مُعاہدانہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی ایسی مدد نہیں کی جا سکے گی جو اِن تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔

آیت میں معاہدے کے لیے ''میثاق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادّہ ''وثوق'' ہے، جو عربی زبان کی طرح اُردو زبان میں بھی بھروسے اور اعتماد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میثاق ہر اُس چیز کو کہیں گے جس کی بنا پر کوئی قوم بطریقِ معروف یہ اعتماد کرنے میں حق بجانب ہو کہ ہمارے اور اس کے درمیان جنگ نہیں ہے، قطعِ نظر اِس سے کہ ہمارا اُس کے ساتھ صریح طور پر عدمِ محاربہ کا عہد و پیمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

پھر آیت میں بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، یعنی ''تمھارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو'' اس سے یہ صاف مُتَرَشّح ہوتا ہے کہ دار الاسلام کی حکومت نے جو معاہدانہ تعلقات کسی غیر مسلم حکومت سے قائم کیے ہوں، وہ صرف دو حکومتوں کے تعلقات ہی نہیں ہیں بلکہ دو قوموں کے تعلقات بھی ہیں اور ان کی اخلاقی ذمہ داریوں میں مسلمان حکومت کے ساتھ مسلمان قوم اور اس کے افراد بھی شریک ہیں۔ اسلامی شریعت اس بات کو قطعاً جائز نہیں رکھتی کہ مسلم حکومت جو معاملات کسی ملک یا قوم سے طے کرے، ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے مسلمان قوم یا اس کے افراد سُبک دوش رہیں۔ البتہ

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنْكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٧٥﴾ ع

ع ۱۰ ۲

وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا۔[۵۲]

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جِدّوجُہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، وہی سچّے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمھارے ساتھ مل کر جِدّوجُہد کرنے لگے، وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔ مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں،[۵۳] یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

حکومتِ دارالاسلام کے معاہدات کی پابندیاں صرف اُن مسلمانوں پر ہی عائد ہوں گی جو اس حکومت کے دائرۂ عمل میں رہتے ہوں۔ اس دائرے سے باہر دنیا کے باقی مسلمان کسی طرح بھی ان ذمہ داریوں میں شریک نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حُدَیبیَہ میں جو صلح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ سے کی تھی، اس کی بنا پر کوئی پابندی حضرت ابوبَصیرؓ اور ابوجَندلؓ اور اُن دوسرے مسلمانوں پر عائد نہیں ہوئی جو دارالاسلام کی رعایا نہ تھے۔

۵۲—اِس فقرے کا تعلق اگر قریب ترین فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ جس طرح کفار ایک دوسرے کی حمایت

کرتے ہیں، اگر تم اہلِ ایمان اُسی طرح آپس میں ایک دوسرے کی حمایت نہ کرو تو زمین میں فتنہ اور فسادِ عظیم برپا ہوگا۔ اور اگر اس کا تعلق اُن تمام ہدایات سے مانا جائے جو آیت ۷۲ سے یہاں تک دی گئی ہیں، تو اِس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے ولی نہ بنیں، اور اگر ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ آنے والے اور دارالکفر میں مقیم رہنے والے مسلمانوں کو اہلِ دارالاسلام اپنی سیاسی ولایت سے خارج نہ سمجھیں، اور اگر باہر کے مظلوم مسلمانوں کے مدد مانگنے پر ان کی مدد نہ کی جائے، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ اس قاعدے کی پابندی بھی نہ کی جائے کہ جس قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو اس کے خلاف مدد مانگنے والے مسلمانوں کی مدد نہ کی جائے گی، اور اگر مسلمان کافروں سے موالات کا تعلق ختم نہ کریں، تو زمین میں فتنہ اور فسادِ عظیم برپا ہوگا۔

۵۳ – مراد یہ ہے کہ اسلامی بھائی چارے کی بنا پر میراث قائم نہ ہوگی اور نہ وہ حقوق جو نسب اور مصاہرت کے تعلق کی بنا پر عائد ہوتے ہیں، دینی بھائیوں کو ایک دوسرے کے معاملے میں حاصل ہوں گے۔ ان اُمور میں اسلامی تعلق کے بجائے رشتہ داری کا تعلق ہی قانونی حقوق کی بنیاد رہے گا۔ یہ ارشاد اس بنا پر فرمایا گیا ہے کہ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات کرائی تھی، اس کی وجہ سے بعض لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ دینی بھائی ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے۔